الرسالہ

ہندستانی مُسلمان

زیرسرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

صحیح رُخ سے دیکھنے والے کو
دنیا امیدوں سے بھری ہوئی نظر آتی ہے ، اور
غلط رُخ سے دیکھنے والے کو ناامیدیوں سے

MAKTABA AL-RISALA
1439 OCEAN AVE. # 4G
BROOKLYN, N. Y. 11230
TEL.: (718) 258-3435

ستمبر ۱۹۹۲ شمارہ ۱۹۰

اجتماع

پچھلے اعلان کے مطابق، الرسالہ مشن اور اسلامی مرکز کے مقصد سے اتفاق رکھنے والوں کا دوسرا کل ہند اجتماع انشاء اللہ ہندستان کے تاریخی شہر بھوپال (مدھیہ پردیش) میں ہوگا۔ انشاء اللہ اس میں صدر اسلامی مرکز شرکت کریں گے۔ اور مشن سے تعلق رکھنے والے دوسرے اکثر اشخاص شریک ہوں گے۔

اجتماع کی کارروائی انشاء اللہ بھوپال کی مشہور مسجد صوفیہ میں ۲۲ اکتوبر ۱۹۹۲ کو بروز جمعرات نماز ظہر کے بعد شروع ہوگی۔ اور ۲۴ اکتوبر بروز سنیچر نماز ظہر کے بعد ختم ہو جائے گی۔ شرکاء حضرات براہ کرم ۲۲ اکتوبر کو ظہر کے وقت تک صوفیہ مسجد (بھوپال) میں پہنچ جائیں۔

اس سلسلہ میں انفرادی دعوت نامے جاری نہیں کیے جا رہے ہیں۔ جو لوگ الرسالہ مشن سے وابستہ ہیں اور اس سے اتفاق رکھتے ہیں وہ اس اعلان کو کافی سمجھیں اور مقررہ وقت پر بھوپال پہنچنے کی کوشش کریں۔ صوفیہ مسجد بھوپال کے محلہ احمد آباد میں واقع ہے۔ ریلوے اسٹیشن سے مسجد صوفیہ کا فاصلہ تین میل ہے۔ اسٹیشن سے بذریعہ بس آنے والے لوگ اسپتال کے بس اسٹاپ پر اتریں۔ انشاء اللہ گاڑی کا انتظام بھی رہے گا۔

جو لوگ اجتماع میں شرکت کا ارادہ رکھتے ہیں وہ اپنے اپنے مقام سے انفرادی یا اجتماعی طور پر اپنی آمد کی اطلاع ناظم اجتماع بھوپال کو روانہ کر دیں تاکہ انتظامات میں آسانی ہو۔ جو لوگ پہلے خط لکھ چکے ہیں وہ بھی ازراہِ کرم دوبارہ ذیل کے پتہ پر اطلاعی کارڈ بھیج کر اپنی تعداد سے مطلع فرمائیں۔

اجتماع میں شرکت کا ارادہ رکھنے والے تمام حضرات کی طرف سے پیشگی اطلاع کا ملنا بہت ضروری ہے۔ اطلاع بھیجنے کا پتہ اور ٹیلی فون نمبر یہ ہے :

ایم۔ وائی۔ فاروقی، آفس سکریٹری الرسالہ اکیڈمی

ہاؤس نمبر ۳۰ احاطہ نور محمد خاں، پیر گیٹ، بھوپال (ایم پی)

M.Y. Farooqi, Office Secretary, Al-Risala Academy
30, Ahata Noor Mohammad Khan, Peer Gate, Bhopal 462001
Phone: (0755) 545956, 545948

ہندستانی مسلمان

مولانا وحید الدین خاں

یقینی ضمانت	۴	کامیابی کا راز	۲۰
ناکامی میں کامیابی	۵	کمزور کڑی	۲۲
ہجرت کی ضرورت	۸	مسائل، مواقع	۲۸
صبر و تحمل کا کرشمہ	۱۲	کرنے کا کام	۲۳
انسان، حیوان	۱۷	ہندستانی مسلمان	۲۶

MAKTABA AL-RISALA
1439 OCEAN AVE. # 4C
BROOKLYN, N. Y. 1
TEL.: (718) 258-

AL-RISALA
C-29 Nizamuddin West New Delhi 110013 Tel. 611128

یقینی ضمانت

قرآن کے مطابق ، اہلِ ایمان کے لیے اس دنیا میں حفاظت کی سب سے بڑی اور یقینی ضمانت یہ ہے کہ وہ صبر اور تقویٰ کی روش پر قائم رہیں۔ قرآن میں مختلف انداز سے اس کا واضح اعلان کیا گیا ہے۔ ایک جگہ اسلام کے بدخواہوں اور دشمنوں کا ذکر کرتے ہوئے قطعی اور حتمی انداز میں ارشاد ہوا ہے:

وَاِن تصبروا و تتقوا لا یضرکم کیدھم شیئاً۔

اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو تو ان کی کوئی مخالفانہ تدبیر تم کو نقصان نہ پہنچائے گی۔

(آل عمران ۱۲۰)

یہ بات جو اس آیت میں کہی گئی ہے ، یہ کوئی پُراسرار بات نہیں۔ یہ ایک سادہ اور فطری حقیقت ہے۔ اپنے آس پاس کے واقعات پر غور کرکے اس کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اگر آپ سچائی اور انصاف پر ہیں اور کوئی شخص آپ کا مخالف بن کر کھڑا ہو تو اس کا یہ اقدام خود اس کی اپنی فطرت کے خلاف ہوتا ہے۔ عین اس وقت بھی اس کی فطرت کی آواز اس کے خلاف فیصلہ دینے کے لیے اس کے اندر موجود ہوتی ہے۔ وہ جب تک ضد اور عناد کی نفسیات میں مبتلا ہے ، وہ آپ کے خلاف کارروائی کرے گا۔ مگر جیسے ہی وہ اعتدال پر آیا وہ آپ کے خلاف اقدام کرنے کا حوصلہ کھو دے گا۔

صبر اور تقویٰ کی روش فریق ثانی کو اسی حالتِ اعتدال پر لانے کی ایک تدبیر ہے۔ صبر کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے شخص کی زیادتیوں پر ردّعمل کا اظہار نہ کیا جائے۔ اور تقویٰ کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اللہ کی عظمتوں کو سوچ کر متواضع بن جائے۔

یہ دونوں صفتیں اگر آدمی کے اندر حقیقی طور پر پیدا ہو جائیں تو وہ بلاشبہ اس کے حریف کو ٹھنڈا کرنے کی یقینی ضمانت ہیں۔ یہ اعلیٰ اخلاق یقینی طور پر اس کے ضد اور عناد کو ختم کرکے اس کو اعتدال کی حالت پر پہنچا دے گا۔ اور جب کوئی شخص معتدل نفسیات والا بن جائے تو خود اس کی اپنی فطرت اس کو ظلم سے روک دیتی ہے ، اس کے بعد اس کے لیے کسی مزید پولس اور فوج کی ضرورت نہیں۔

ناکامی میں کامیابی

حضرت یوسف علیہ السلام کے دشمنوں نے آپ کو ایک سنسان کنویں میں ڈال دیا۔ بظاہر یہ ہلاکت کا واقعہ تھا۔ مگر عین اس وقت خدا نے حضرت یوسف کو مطلع کیا کہ ہلاکت کے اس کنویں سے تمہارے لئے ایک نئی زندگی برآمد ہوگی۔ قرآن میں ہے کہ جب حضرت یوسف کے دشمنوں نے آپ کو کنویں میں ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف کے پاس وحی بھیجی کہ عنقریب تم ایسی بلندی پر پہنچو گے کہ تمہارے بھائی تمہیں دیکھ کر پہچانیں گے بھی نہیں۔ (یوسف ۱۵) گویا خدا نے حضرت یوسف کے واقعہ کو ظاہری پہلو سے دیکھنے کے بجائے اس کے اندرونی پہلو کے اعتبار سے دیکھا۔ اس کو حال کے اعتبار سے دیکھنے کے بجائے مستقبل کے اعتبار سے دیکھا۔ اس نظر سے دیکھنے میں ساری بات بدل گئی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت حضرت یوسف کو مطلع کیا کہ تمہارا اَسوء القصص آئندہ اَحسن القصص بننے والا ہے۔ جہاں لوگوں نے تمہاری تاریخ ختم کر دینی چاہی تھی وہیں سے تمہاری نئی تاریخ شروع ہو جائے گی۔

ایک حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله۔ مومن کی ہوشیاری سے ڈرو کیوں کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔ حضرت یوسف کے واقعہ کا یہ پہلو گویا اس حدیث کی تشریح ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے نور سے دیکھنے کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے چیزوں کو ان کے اندرونی امکانات کے اعتبار سے دیکھنا۔ جب اس طرح کسی واقعہ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو قصہ بظاہر اَسوء القصص تھا وہ مستقبل کے اعتبار سے اَحسن القصص ہے۔ نور خداوندی سے دیکھنے والا ناموافق میں موافق کو دیکھ لیتا ہے۔ وہ تاریک حالات میں روشن حالات کا پتہ لگا لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی منصوبہ بندی میں تسخیر کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی منصوبہ بندی کا مقابلہ وہ لوگ نہیں کر سکتے جو حالات کو صرف ظاہر کے اعتبار سے دیکھنا جانتے ہوں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو دیگر اقوام سے مختلف قسم کی تکلیفیں پہنچی ہیں اور پہنچ رہی ہیں۔ یہ بات یقیناً افسوسناک ہے لیکن اگر معاملہ کو صرف اس کے ظاہری پہلو کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ہمیں اس کے سوا کوئی اور کرنے کا کام نظر نہ آئے گا کہ کچھ قوموں کو ظالم قرار دے کر ان کے خلاف احتجاج اور شکایت کا طوفان برپا کرتے رہیں۔ بدقسمتی سے موجودہ زمانہ کے مسلمان یہی ایک کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے ابھی تک اس واقعہ کو نورِ خداوندی سے نہیں دیکھا۔ اگر وہ اس کو نورِ خداوندی سے دیکھتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ جہاں تاریک پہلو ہے وہاں روشن پہلو بھی موجود ہے۔ جو قصہ بظاہر اسوء القصص نظر آتا ہے وہ احسن القصص میں بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

یہاں میں انسانی تاریخ کا ایک حوالہ دینا چاہتا ہوں جس کو خصوصیت سے آرنلڈ ٹوائن بی نے ریکارڈ کیا ہے۔ آرنلڈ ٹوائن بی مشہور انگریز مورخ ہے جس کی کتاب اسٹڈی آف ہسٹری اپنے موضوع پر نہایت اہم سمجھی جاتی ہے۔ ٹوائن بی نے اس کتاب میں قدیم وجدید دنیا کی ۲۱ تہذیبوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس تفصیلی مطالعہ کے بعد اس نے ایک بڑی عجیب بات لکھی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ میں نے اپنے مطالعہ میں پایا کہ دنیا کی جن قوموں نے کوئی تہذیب پیدا کی وہ اکثر وہ تھیں جو اپنی زندگی میں شکست سے دوچار ہوئیں۔ جنھیں سخت ناموافق حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی قوم کے موافق حالات ہمیشہ اس کے ناموافق حالات کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں۔

ٹوائن بی کے اس نظریہ کی ایک واضح مثال جدید تہذیب ہے جو مغربی قوموں کے ذریعہ پیدا ہوئی۔ مغربی قوموں کے عروج سے پہلے دنیا کے بڑے حصہ پر مسلمانوں کا اقتدار تھا۔ مسلمانوں نے اس زمانہ میں شام اور فلسطین پر قبضہ کر لیا جو مغرب کی مسیحی قوموں کے نزدیک مقدس مقام کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ ان مقدس مقامات کو واپس لینے کے لئے مغرب کی مسیحی قومیں متحدہ طاقت سے مسلم دنیا پر حملہ آور ہوئیں۔ ان جنگوں کو تاریخ میں صلیبی جنگیں (Crusades) کہا جاتا ہے۔ یہ صلیبی جنگیں ۱۰۹۵ء سے ۱۲۷۱ء تک جاری رہیں۔ یعنی وقفہ وقفہ سے پورے دو سو سال تک۔ مگر آخر کار مغربی قوموں کو ذلت آمیز شکست

ہوئی۔ وہ اپنے مقدس مقامات کو حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوئے۔

مغربی قوموں کی یہی وہ ناکامی ہے جس کے بطن سے جدید تہذیب نکلی۔ جس نے مغربی قوموں کو سارے عالم میں غالب کر دیا۔ صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد مغربی قومیں اپنا جنگی حوصلہ کھو چکی تھیں۔ اب انھیں اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا کہ وہ جنگ کے میدان میں مسلمانوں کو چیلنج کر سکیں۔ ان حالات نے ان کے اندر ایک نیا ذہن ابھارا جس کو ان کے مفکرین نے روحانی کروسیڈ (Spiritual crusades) کا نام دیا، یعنی غیر حربی میدان میں مقابلہ۔ اب انھوں نے مسلمانوں کے علوم سیکھنے شروع کئے۔ عربی زبان کی علمی کتابیں لاطینی میں ترجمہ کی گئیں۔ اولاً انھوں نے مسلمانوں کے علوم کو سیکھا۔ اور اس کے بعد اس میں اضافہ کرنا شروع کیا۔

یہ کوششیں کئی سو سال تک جاری رہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے علم و فن کی دنیا میں اتنی ترقی کی کہ تاریخ انسانی کو نئے دور میں داخل کر دیا۔ انھوں نے روایتی دور کی جگہ سائنسی دور پیدا کیا۔ انھوں نے دستکاری نظام کو مشینی نظام میں تبدیل کر دیا۔ وغیرہ

اس ترقی کے بعد ان کی طاقت بے پناہ ہو چکی تھی۔ انھوں نے نہ صرف مسلم قوموں کو از سر نو مغلوب کیا بلکہ ساری دنیا پر براہ راست یا بالواسطہ انداز میں غلبہ حاصل کر لیا۔ وہ تمام اقوام کے اوپر قائد بن کر کھڑے ہو گئے۔

مغربی اقوام کی یہ عظیم کامیابی ان کی عظیم ناکامی سے برآمد ہوئی۔ صلیبی دور کی شکستوں نے ان کو موجودہ دور کی فتح تک پہنچایا۔

خدا کی اس دنیا میں شکست بھی فتح کا دروازہ ہے۔ یہاں ناکامی میں بھی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔ بشرطیکہ اس کو جان کر اسے استعمال کیا جائے۔

ہجرت کی ضرورت

اسلام کے اصولوں میں سے ایک اصول وہ ہے جس کو ہجرت کہا جاتا ہے۔ ہجرت کی ایک صورت زمینی انتقال ہے۔ مگر یہی کل ہجرت نہیں۔ ہجرت دراصل اسلامی مشن کا ایک مرحلہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک میدان کار میں عمل کرنا بے نتیجہ بن گیا ہو تو مشن کے افراد اس میدان کو چھوڑ کر دوسرے ایسے میدان میں منتقل ہو جائیں جہاں نتیجہ خیز کام کرنے کا امکان نظر آتا ہو۔

پچھلے سو سال سے مسلمانوں نے مبنی بر غیر تحریکیں چلائیں اور وہ سب کی سب بے نتیجہ رہیں۔ اب مسلمانوں کو مبنی بر غیر میدان سے نکل کر مبنی بر خویش میدان میں آجانا چاہیے جہاں نتیجہ حاصل کرنا بلاشبہ یقینی ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں ہندستانی مسلمانوں نے پُرشور خلافت تحریک چلائی۔ مگر تحریک جب اپنے آخری عروج پر پہنچ گئی تو معلوم ہوا کہ اس کا سرا ترکی کے حکمراں کمال اتاترک کے ہاتھ میں تھا۔ ۱۹۲۴ میں کمال اتاترک نے خلافت کے ادارہ کے خاتمہ کا اعلان کر دیا اور ہندستان کی تحریک خلافت اچانک زمین بوس ہو کر رہ گئی۔

یہی حال موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام تحریکوں کا ہوا ہے۔ ہر بار وہ اپنی تحریک ایسی زمین پر اٹھاتے ہیں جس کا سرا کسی اور کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی ہنگامہ خیز تحریک بالآخر کسی غیر کی ایک کارروائی سے ختم ہو جاتی ہے۔ ہر بار یہ ہوتا ہے کہ ابتدا میں مسلمان کامیابی کا جشن مناتے ہیں اور آخر میں شکایت اور فریاد کا دفتر لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس کی ایک تازہ مثال وہ ہے جو اگست ۱۹۹۱ میں پیش آئی۔

اسلامک فقہ اکیڈمی کے زیر اہتمام چوتھا فقہی سیمینار حیدرآباد میں ۹-۱۲ اگست ۱۹۹۱ کو ہوا۔ اس کی روداد لکھنؤ کے ماہنامہ الفرقان (اکتوبر۔ نومبر ۱۹۹۱) میں شائع ہوئی ہے۔ اس کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

اس سیمینار میں ہندستان بھر کے علماء و فقہاء نیز مصر، سعودی عرب، پاکستان اور بنگلہ دیش کے ممتاز اہل علم شریک ہوئے۔ اس سیمینار میں جو مسلم مسائل زیر بحث تھے ان میں سے ایک "ہندستان کے موجودہ حالات اور مسلمانوں کی جان و مال پر مسلسل منصوبہ بند حملوں سے پیدا ہونے والی صورتحال

میں جان و مال کے انشورنس کا مسئلہ" بھی تھا۔

مباحثہ کا آغاز کرتے ہوئے کہا گیا کہ موجودہ حالات یہ ہیں کہ منظم منصوبہ بندی کے تحت ہندستانی مسلمانوں کی نسل کشی کی جارہی ہے اور اقتصادی طور پر ان کو کنگال بنا دینے کی زبردست کوشش ہورہی ہے۔ یہ بات عیاں ہوچکی ہے کہ فسادات وقتی جھگڑے سے نہیں پھوٹ پڑتے بلکہ مہینوں پہلے سے کی گئی منصوبہ بند تیاریوں سے ہوتے ہیں۔ ان حالات میں کیا ہم بدرجہ مجبوری مسلمانوں کو یہ مشورہ دے سکتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں یا اپنے املاک کا بیمہ کروالیں۔ اور انشورنس کی اسکیموں کا فائدہ اٹھائیں۔ کیوں کر یہ دیکھا گیا ہے کہ فساد کے موقع پر ان دکانوں کو نہیں جلایا گیا یا ان اموال کو برباد نہیں کیا گیا جن کا بیمہ کروایا جاچکا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ جان کر کہ مسلمانوں نے اب عام طور پر اپنی جانوں اور اپنی املاک کا بیمہ کرالیا ہے، انتظامیہ فسادات روکنے کے سلسلہ میں زیادہ چوکنا ہوجائے۔

اس مباحثہ کے دوران یاد دلایا گیا کہ ۱۹۶۵ میں مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء (لکھنؤ) نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ضرورت شدیدہ کے پیش نظر اگر کوئی شخص اپنی زندگی یا اپنے مال یا اپنی جائداد کا بیمہ کرائے تو شرعاً اس کی گنجائش ہے۔

رپورٹ کے مطابق علماء کے درمیان طویل، دلچسپ، پُرمغز، مفید اور زوردار مباحثہ کے بعد تقریباً طے ہوگیا کہ فرقہ وارانہ فسادات میں مسلمانوں کو جان و مال کے مسلسل نقصان سے بچانے کے لیے انھیں انشورنس کی اجازت دے دی جائے۔ پروگرام یہ تھا کہ ۱۲ اگست ۱۹۹۱ کی نشست میں مذکورہ مفہوم کی تجویز پیش کرکے رسمی طور پر اس کو منظور کرالیا جائے گا۔ مگر عین اس دن حیدرآباد کے ایک مسلم ڈاکٹر وہاں آئے۔ وہ انشورنس کے قواعد وضوابط سے متعلق ضروری دستاویزات اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ اس میں انھوں نے ایک خاص حصہ کو پہلے ہی سے نشان زد کردیا تھا جو زیر بحث موضوع سے متعلق تھا۔ ان نشان زد سطروں سے یہ بات مشکوک ہوگئی کہ فسادات کے نتیجہ میں ہلاک ہونے والے افراد کو انشورنس کا فائدہ مل سکے گا۔

ان نشان زد سطروں میں کہا گیا تھا کہ انشورنس کارپوریشن اس بات کی ذمہ دار نہ ہوگی کہ وہ محولہ اے اور بی کے قاعدہ کے تحت کسی شخص کو مقررہ مزید رقم ادا کرے، جب کہ زیر بیمہ شخص کی معذوری یا موت قانون کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہو، یا ان زخموں کے سبب سے ہو جو فسادات، سماجی شورش

یا بغاوت کے دوران پیش آئیں :

The Corporation shall not be liable to pay the additional sum referred in (a) or (b) above if the disability of the death of the Life Assured shall:
(iii) result from the Life Assured committing any breach of law; or
(iv) be caused by injuries resulting from riots, civil commotion, rebellion.

مذکورہ واقعہ سامنے آنے کے بعد ساری صورت حال بدل گئی۔ چنانچہ سیمینار میں شرکت کرنے والے سب حضرات نے یہ رائے دی کہ اس حالت میں انشورنس کے بارہ میں کوئی فیصلہ کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ چنانچہ اعلان کر دیا گیا کہ اس مسئلہ پر مزید تحقیق کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی جاتی ہے جس کی تجویز آئندہ سیمینار میں پیش کی جائے گی۔

۱۹۶۵ سے ۱۹۹۱ تک مسلم رہنما فرقہ وارانہ فسادات کا یہ حل تجویز کرتے رہے کہ مسلمان اپنی جان و مال کا بیمہ کرائیں۔ مگر بیمہ کمپنی پر مسلمانوں کا قبضہ نہیں تھا بلکہ کسی اور کا قبضہ تھا۔ اس نے مسلمانوں کا رجحان دیکھ کر یہ ضابطہ بنا دیا کہ فسادات میں جو ہلاکت ہوگی، بیمہ کمپنی اس کی تلافی کرنے کی ذمہ دار نہ ہوگی۔ غیر کی ایک جنبش قلم سے مسلمانوں کا سارا منصوبہ ڈھ کر رہ گیا۔

تدبیر کی تبدیلی

فرقہ وارانہ فسادات کے مسئلہ کا واحد قابل عمل حل ہجرت ہے۔ یعنی میدان محنت کی تبدیلی۔ ان فسادات کے معاملہ میں اب تک مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے "مبنی بر غیر" انداز میں اپنی تحریک چلاتے رہے ہیں۔ یعنی فرقہ وارانہ تنظیموں کے خلاف احتجاج۔ حکومت اور انتظامیہ سے مطالبہ کرنا کہ وہ فساد کو روکیں۔ مگر ان کوششوں کے نتیجہ میں فسادات میں ایک فی صد بھی کمی نہیں آئی۔

اب مسلمانوں کو اس معاملہ میں "مبنی بر خویش" روش پر آجانا چاہیے۔ یعنی خود اپنی بنیاد پر سوچنا۔ خود اپنی کوشش سے مسئلہ کا حل نکالنا۔

مبنی بر خویش حل سے میری مراد ہرگز، فاعی تدبیر نہیں ہے جس کو مسلمانوں کے کچھ نادان لکھنے اور بولنے والے لوگ پیش کر رہے ہیں۔ نام نہاد دفاع اس مسئلہ کو صرف بڑھانے والا ہے۔ وہ ہرگز اس کو گھٹانے

والا نہیں۔ مبنی بر خویش حل سے میری مراد صرف صبر و اعراض ہے۔ اس مسئلہ کا واحد یقینی حل صبر و اعراض ہے۔ یہ حل وہ ہے جو مکمل طور پر مسلمانوں کے اپنے اختیار میں ہے۔ یہاں کسی دوسرے کے لیے یہ موقع نہیں کہ وہ اپنی حرکتِ لب یا جنبشِ قلم سے اس کو بے اثر بنا دے۔

صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ اپنے دشمنوں پر اس وقت تک غالب رہو گے جب تک تم میرے طریقہ کو پکڑے رہو۔ اگر تم میرے طریقہ سے ہٹ گئے تو اللہ تمہارے اوپر ایسے لوگوں کو مسلط کر دے گا جو نہ تم سے ڈریں گے اور نہ تم پر رحم کریں گے، یہاں تک کہ تم میری سنت کی طرف لوٹ آؤ :

لازلتم منصورین علی اعدائکم ما دمتم متمسکین بسنتی۔ فإن خرجتم عن سنتی سلط اللہ علیکم من لا یخافکم ولا یرحمکم حتی تعودوا إلی سنتی۔

مسلمانوں کی موجودہ حالت حقیقۃً ترکِ سنت کا نتیجہ ہے نہ کہ کسی دشمن کی سازش کا نتیجہ۔ فسادات کے پس منظر میں مسلمانوں نے جس سنت کو ترک کیا ہے وہ صبر و اعراض کی سنت ہے۔ اسی سنت کو چھوڑنے سے موجودہ صورت حال پیدا ہوئی ہے اور دوبارہ اسی سنت کو اختیار کر کے اس صورت حال کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسری تدبیر اس مسئلہ کو حل کرنے والی نہیں۔

مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ بے صبری سے صبر کی طرف لوٹیں۔ وہ ٹکراؤ کو چھوڑ کر اعراض کی طرف واپس آئیں۔ اشتعال انگیزی پر مشتعل ہو جانے کے بجائے وہ اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہونے کا طریقہ اختیار کریں۔ یہی پیغمبرِ اسلام کی سنت ہے اور اسی سنت میں کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔

مسلمانوں کو آج ایک ہجرت کرنا ہے۔ یہ تدبیری ہجرت ہے نہ کہ کوئی جغرافی ہجرت۔ اسی ہجرت میں ان کی کامیابی کا یقینی راز چھپا ہوا ہے۔

صبر و تحمل کا کرشمہ

جناب محمد کلیم اللہ صاحب مدراس کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے مکمل حوالے کے ساتھ مدراس کے دو تقابلی واقعات ہمیں لکھ کر بھیجے ہیں۔ ان واقعات میں بہت بڑا سبق ہے۔ موصوف کا پتہ یہ ہے :

Mohammad Kalimullah, 352, T.T.K. Road,
Raya Pettah, Madras 600014.

ان کا خط مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۹۱ اور مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۱ ہمارے سامنے ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے مدراس کے انگریزی روزنامہ ہندو کی ایک کاپی روانہ کی ہے جس کے صفحہ ۳ پر مذکورہ واقعہ کی رپورٹ شائع کی گئی ہے۔ یہ رپورٹ مکمل طور پر اس صفحہ کے نیچے نقل کی جا رہی ہے۔ خبر یہ ہے :

مدراس میں ہر سال گنیش چترتھی کا جلوس نکلتا ہے۔ پچھلے سال ہندوؤں کا یہ مذہبی جلوس ۲۱ ستمبر ۱۹۹۰ کو نکلا تھا۔ یہ جلوس چلتا ہوا ٹریپلی کین ہائی روڈ میں داخل ہوا۔ یہ ایک مسلم علاقہ ہے۔ یہاں مسجد کے سامنے باجا بجایا گیا اور اشتعال انگیز نعرے لگائے گئے۔ اس پر مسلمان مشتعل ہو گئے۔ آخر کار مسلمانوں اور پولیس کے درمیان باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی۔ پولیس نے گولی چلائی جس کے نتیجہ میں دو مسلمان مارے

RESTRAINT PREVENTED LARGE SCALE VIOLENCE

Two organisations -- Citizens for a Secular Society and Penn -- a Centre for Women's Studies -- have expressed deep concern over the Vinayaka Chathurthi procession on Sunday.

In a statement they said "the processions were far from religious in nature. What we found instead was an aggressive and communal campaign directed against members of the minority community. The processionists were boisterous young men, a number of them carrying sticks, shouting slogans like 'This is a Hindu nation and only Hindus can live here.' 'We will destroy the mosque and build a Ram temple.' 'Fearless Hindus, come forward as a battalion.'

This show of communal viciousness made a mockery of a supposedly religious occasion. Members of the minority community, on the whole showed great restraint. It was this, combined with effective police presence that, in our opinion, prevented large scale violence.

The attention of the public is drawn to this transforming of a religious event by blatantly communal and political organisations.

The Hindu (Madras), September 26, 1991.

گئے۔ بہت سے زخمی ہوئے۔ مسلمانوں کی کئی دکانوں میں توڑ پھوڑ کی گئی۔ جانی اور مالی دونوں نقصان صرف مسلمانوں کا ہوا۔

گنیش چترتھی کا یہ جلوس اس سال بھی ۱۲ ستمبر ۱۹۹۱ کو نکالا گیا۔ مگر اس سال مسلمانوں نے جوش کے بجائے ہوش سے کام لیا۔ انھوں نے اس بار "اعراض کرو اور کامیابی حاصل کرو" کا فارمولا استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ جلوس نے حسب معمول مسلم محلہ میں باجا بھی بجایا اور اشتعال انگیز نعرے بھی لگائے۔ مگر مسلمانوں نے نہ تو روٹ بدلنے کا مطالبہ کیا اور نہ وہ اشتعال انگیز باتوں پر مشتعل ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جلوس سڑک پر چلتا ہوا گزر گیا۔ مسلمانوں کا کوئی جانی یا مالی نقصان نہیں ہوا۔ علاقہ میں مکمل طور پر امن قائم رہا۔

موجودہ واقعہ پر مدراس کے انگریزی اخبار ہندو (۲۶ ستمبر ۱۹۹۱) نے جو رپورٹ چھاپی ہے وہ نہایت سبق آموز ہے۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ پچھلے سال کے برعکس، اس سال جلوس کے واقعہ پر فساد نہ ہونے کا خاص سبب مسلمانوں کا صبر و تحمل کا رویہ تھا، دو ہندو تنظیموں نے مسلمانوں کی تعریف کرتے ہوئے ہندوؤں کے جلوس کی مذمت کی ہے اور کہا ہے کہ وہ مذہب کے نام پر فرقہ واریت پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جلوس والوں نے اقلیتی فرقہ کے خلاف قابل اعتراض نعرے لگائے جن کا مذہب سے کوئی بھی تعلق نہیں تھا۔ انھوں نے مدراس پولیس کی بھی تعریف کی جس نے شہر کو نقض امن سے بچانے کی موثر تدابیر اختیار کیں (صفحہ ۲)

اس خبر پر غور کیجئے۔ ایک ہی واقعہ ایک ہی محلہ میں دو بار ہوتا ہے، ایک بار وہاں فساد ہو جاتا ہے، اور دوسری بار فساد نہیں ہوتا۔ اس فرق کا سبب جلوس والوں کا رویہ نہیں ہے بلکہ محلہ والوں کا رویہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فساد کا ہونا یا نہ ہونا تمام تر "محلہ والوں" کے اختیار میں ہے۔ وہ چاہیں تو ایک قسم کا ردعمل اختیار کر کے معاملہ کو فساد تک پہنچا دیں اور چاہیں تو دوسرے قسم کا ردعمل اختیار کر کے فساد کی جڑ کاٹ دیں۔

دوسرا سبق اس میں یہ ہے کہ مسلمان اگر ان مواقع پر مخالفانہ ردعمل کا مظاہرہ کریں تو معاملہ پولیس اور مسلمان کا بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ اعراض کا طریقہ اختیار کریں تو معاملہ جلوس والوں کا اور پولیس کا رہتا ہے۔ ایک صورت میں مسلمان پولیس کے نشانہ پر آجاتے ہیں اور دوسری صورت

میں جلوس والے۔

تیسرا سبق یہ ہے کہ تحمل کا رویہ نہایت اثر کرنے والا رویہ ہے۔ چنانچہ مدراس کے مذکورہ واقعہ پر جب مسلمانوں نے تحمل کا رویہ اختیار کیا تو خود اکثریتی فرقہ کے اندر سے ایسے افراد اٹھے جنھوں نے جلوس والوں کی مذمت کی۔ اور مسلمانوں کی شرافت کا واضح طور پر اعتراف کیا۔ اخبارات میں مسلمانوں کو شاندار پرسراہا گیا اور دوسرے گروہ کو کنڈم کیا گیا۔

یہ سارا کرشمہ صرف ایک چیز کا تھا، اور وہ صبر ہے جس کو اخبار ہندو نے اپنے تبصرہ میں برداشت (restraint) کا نام دیا ہے۔

مسئلہ کا حل

۱۹۴۷ کے بعد کے دور میں ہندستان کے مسلمانوں کے ذہن پر سب سے زیادہ جو مسئلہ چھایا رہا ہے، وہ فرقہ وارانہ فساد کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ مسلمانوں کو مستقل طور پر عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا رکھتا ہے۔ مگر مذکورہ واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ اس مسئلہ کا حل مسلمانوں کے اپنے اختیار میں ہے۔ مسلمان سادہ طور پر صرف یہ کریں کہ وہ کچھ نہ کریں، اور اس کے بعد یقینی طور پر وہ فساد کی مصیبت سے نجات پا جائیں گے۔

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ صبر مومن کے لیے بچاؤ کا ذریعہ ہے (الصبر معقل المومن) مذکورہ واقعہ، اور اس طرح کے دوسرے واقعات، اس قول رسولؐ کی عملی تصدیق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صبر و اعراض کی صورت میں اہل ایمان کو ایک ایسی ڈھال دے دی ہے جو بے خطا اپنا عمل کرتی ہے۔ جب بھی آپ صبر کی تدبیر اختیار کریں وہ آپ کے لیے یقینی بچاؤ کا ذریعہ بن جائے گا۔

انسان عین اپنی پیدائشی ساخت کے مطابق اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ کسی کے خلاف زیادتی کرنے کے لیے جواز (justification) چاہتا ہے۔ جب آپ کسی کی اشتعال انگیزی پر مشتعل ہوں تو گویا آپ اس کو یہ جواز دے رہے ہیں کہ وہ آپ کے خلاف زیادتی کرے۔ لیکن جب آپ اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہوں تو گویا آپ نے اس سے زیادتی کرنے کا جواز چھین لیا۔

یہ دوسرا رویہ مومن کے حق میں ڈھال کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب آپ یہ دوسرا رویہ اختیار کریں تو اس کے بعد آپ اپنے حریف کی فطرت کو اپنا وکیل بنا لیتے ہیں۔ اس کے بعد آپ حریف کے

اندر اپنا ایک حامی کھڑا کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد آدمی خود اپنی اندرونی کیفیت کے اعتبار سے مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ آپ کے خلاف زیادتی کرنے سے باز رہے۔ اور جو آدمی خود اپنے خلاف شکست کھا جائے وہ کوئی ظالمانہ اقدام کرنے کے لیے اسی طرح نااہل ہو جاتا ہے جس طرح ایک غبارہ ہوا نکلنے کے بعد اڑنے کے لیے۔

قرآن کی ہدایت

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اگر تم لوگ صبر کا طریقہ اختیار کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کی کوئی سازش تم کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکے گی۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ ان سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے (وان تصبروا وتتقوا لا یضرکم کیدھم شیئا ان اللہ بما یعملون محیط) آل عمران ۱۲۰

ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اس آیت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ وہ صبر اور تقویٰ کے ذریعہ شر پسندوں کے شر سے اور فاجروں کی سازش سے اپنے آپ کو بچائیں (یرشدھم اللہ تعالیٰ الی السلامۃ من شر الاشرار وکید الفجار باستعمال الصبر والتقوی) تفسیر ابن کثیر ۱/۳۹۹

صفوۃ التفاسیر میں ہے کہ اگر تم نے ان کی ایذا پر صبر کیا اور اپنے اقوال اور اعمال میں تم اللہ سے ڈرے تو ان کی سازش اور ان کی تدبیر تم کو کچھ نقصان نہ پہنچائے گی۔ پس اللہ نے ان کے ضرر کو ختم کرنے کے لیے صبر اور تقویٰ کی شرط لگائی (ای ان صبرتم علی ایذاھم واتقیتم اللہ فی اقوالکم واعمالکم لا یضرکم مکرھم وکیدھم۔ فشرط اللہ تعالیٰ نفی ضررھم بالصبر والتقوی) ۱/۲۲۶

ہندستان میں فرقہ پرستوں کے جلوس اور ان کے دل آزار نعروں کے سلسلہ میں صبر اور تقویٰ کا انطباق کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مسلمان ان کی اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہوں۔ وہ ان کی دل آزاری کو یک طرفہ طور پر برداشت کر لیں۔ وہ ردعمل کا اظہار کرنے کے بجائے خاموشی کا رویہ اختیار کریں۔ وہ ہمیشہ صبر کے رویہ پر قائم رہیں۔

دوسرے یہ کہ وہ کسی حال میں بھی تقویٰ کی روش نہ چھوڑیں۔ ایسے مواقع پر دنیوی انجام سے زیادہ اخروی انجام کو وہ اپنے سامنے رکھیں۔ وہ قوم پرستی کے بجائے اصول پسندی کا انداز اختیار کریں۔ فریق ثانی کی دشمنی کے باوجود وہ اس کے ساتھ بے انصافی نہ کریں۔ وہ جو کچھ کریں یہ سمجھ کر کریں کہ

ان کو اللہ کے یہاں اس کا جواب دینا ہے۔ وہ اللہ کے معاملہ میں حساس اور انسانوں کے معاملہ میں غیر حساس بن جائیں۔

مسلمان اگر اس طرح صبر و تقوی کا طریقہ اختیار کریں تو یقینی طور پر مخالفین کی ہر سازش بے اثر ہو جائے گی۔ ہر مخالفانہ تدبیر ان کے حق میں ناکام ثابت ہوگی۔

مذکورہ آیت میں ارشاد ہوا ہے کہ إن اللہ بما یعملون محیط (اللہ ان کی سرگرمیوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے) یہ فقرہ بہت بامعنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے شر پسندوں کے شر سے بچاؤ کے لیے صبر و تقوی کے جس طریقہ کی تعلیم دی ہے وہ ایک ایسا طریقہ ہے جو معاملہ کے اوپر پوری طرح حاوی ہے۔ وہ یقینی طور پر ایک بے خطا طریقہ ہے۔ وہ کبھی ناکام ہونے والا نہیں۔

اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ وہ انسان کی سرشت اور اس کے مزاج سے پوری طرح باخبر ہے۔ اس نے جو اصلاحی اور دفاعی تدبیر بتائی ہے وہ اپنے علم کلی کے تحت بتائی ہے۔ اللہ کے لیے یہ ایک پوری طرح معلوم مسئلہ کا پوری طرح معلوم جواب ہے۔ یہ حل تمام متعلق پہلوؤں کا مکمل احاطہ کیے ہوئے ہے۔ کوئی بھی صورت حال ایسی نہیں جو اس کے دائرۂ اثر سے خارج ہو۔

ان خصوصیات نے اس حل کو ایک بے خطا حل بنا دیا ہے۔ تم جب بھی اس کو استعمال کرو گے اس کا نتیجہ تمہارے حق میں ہی نکلے گا۔ کوئی بھی انسانی گروہ اس کے دائرہ سے باہر نہیں۔ شر انگیزی کی کوئی بھی آگ ایسی نہیں جو اس طریقہ کو کام میں لاکر بجھائی نہ جا سکتی ہو۔ اس تدبیر کے اندر ہر بم کو ناکارہ بنا دینے کی طاقت ہے، خواہ بظاہر وہ کیسا ہی خطرناک بم کیوں نہ ہو۔

انسان، حیوان

پٹنہ کی خدا بخش لائبریری سے ایک جرنل شائع ہوتا ہے۔ اس کے نمبر ۴۹ (۱۹۸۹) میں شری شمبھر ناتھ پانڈے کا ایک مفصل مضمون چھپا ہے اس کا عنوان ہے "ہندستان میں قومی یک جہتی کی روایات"۔ یہ فخرالدین علی احمد میموریل لکچر کے تحت ۱۹۸۶ میں لکھنؤ کے ایک اجتماع میں پڑھا گیا تھا۔ اس لکچر کے آخر میں انھوں نے اپنا ایک ذاتی واقعہ بیان کیا ہے جو انھیں کے الفاظ میں یہ ہے :

اکتوبر ۱۹۶۹ میں تمام ملک میں گاندھی جی کی پیدائش کا سو سالہ جشن منایا گیا۔ لیکن ہمارے ملک کی ایک فرقہ پرست جماعت نے اس موقعے کو فرقہ وارانہ فساد کے لیے چنا اور وہ بھی احمد آباد کے شہر کو، جہاں گاندھی جی نے ۱۹۱۵ میں اپنی قومی خدمات کی ابتدا کی تھی۔ اس وقت وہاں جس صوبائی پارٹی کی سرکار برسر اقتدار تھی وہ مرکزی سرکار کے اثر سے باہر تھی۔ دنگائی بے خوف مکانوں کو جلاتے رہے، دکانوں کو لوٹتے رہے۔ اور معصوم انسانوں کا قتل کرتے رہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گاندھی جی کے ساتھ وابستہ اس شہر سے انسانیت رخصت ہو چکی ہے۔ محترم وزیر اعظم اندرا گاندھی نے مجھ سے کہا کہ "بہت سے لوگ وہاں گئے ہیں اور لوٹ کر مجھے اپنی رپورٹیں دی ہیں۔ لیکن مجھے تسلی نہیں ہوئی ہے، میں چاہتی ہوں کہ آپ وہاں جائیں، شہر میں گشت کریں اور اس بات کو دیکھیں کہ حیوانیت کے بیچ میں کیا وہاں انسانیت بھی زندہ ہے؟"

میں احمد آباد گیا۔ قریب مہینے بھر وہاں رہا۔ زخمیوں سے اسپتال میں ملا۔ مظلوموں کی دردناک کہانیاں سن کر ان کے آنسو پونچھے۔ قریب چھ ہزار مکان جلا دیے گئے تھے۔ اور وہاں کی سرکار کے بیان کے مطابق ساڑھے تین سو آدمی، لیکن فوجی انٹلی جنس کے آنکڑوں کے مطابق قریب دو ہزار آدمی، اس فرقہ وارانہ فساد میں شہید ہوئے۔ مظلوموں کی کثیر تعداد اقلیتی فرقے کی تھی۔ ایک دن گشت کرتا ہوا میں میو بائی کی چال میں پہنچا۔ وہاں محلوں کو چال کہتے ہیں۔ میرے پہنچنے پر اس علاقے کے سو ڈیڑھ سو آدمی جمع ہو گئے۔ چال کے سبھی مکان جلے ہوئے تھے۔ دو چار مکانوں سے اب بھی دھواں نکل رہا تھا۔ میں نے ان سے سوال کیا۔ "کیوں بھائیو! کیا یہ سب کے سب مکان مسلمانوں کے تھے؟"

چالیس پینتالیس برس کی عمر کے ایک صاحب نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا: "جی نہیں، یہاں پینتیس گھر مسلمانوں کے تھے اور ۱۲۰ گھر ہندوؤں کے تھے۔"

میں نے پوچھا آپ کا نام ؟ جواب ملا "میرا نام کلیان سنگھ ہے۔"

میں نے پھر پوچھا: "تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک بار مسلمانوں کا مجمع آیا جو ہندوؤں کے مکان جلا گیا، اور دوبارہ ہندوؤں کا مجمع آیا جو مسلمانوں کے مکان جلا گیا ؟"

وہ صاحب بولے: "جی نہیں۔ مجمع تو ایک ہی آیا تھا اور وہ ہندوؤں کا تھا۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا: "تو کیا ہندوؤں نے ہی ہندوؤں کے مکان جلا دیے ؟"

جواب ملا: "جی۔" میں نے کہا: "آپ کا گھر کون سا ہے ؟" انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا: "وہ جس سے اب بھی دھواں نکل رہا ہے۔ اس میں میری رہائش بھی تھی اور دکان بھی۔ دکان موٹروں کے ٹائروں اور سائیکل کے ٹائروں کی تھی۔ اسی وجہ سے دھواں اب بھی نکل رہا ہے۔"

میں نے پھر پوچھا: "کلیان سنگھ جی! کتنے کی مالیت رہی ہوگی ؟"

جواب ملا: "مکان کی مالیت تو قریب ایک لاکھ ہی ہوگی اور دکان کی بھی کم و بیش اتنی ہی۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا: "آخر ہندوؤں کے مکان جلانے کی وجہ کیا تھی ؟"

کلیان سنگھ نے کہا: "مجمع نے آکر ہم لوگوں سے پوچھا کہ ہمیں یہ بتاؤ کون سے مکان ہندوؤں کے ہیں اور کون سے مسلمانوں کے۔ ہم ہندوؤں کے مکانوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کے مکان جلانا چاہتے ہیں۔ ہم نے انھیں یہ بتانے سے انکار کر دیا۔ اس پر وہ بہت خفا ہوئے۔ اور لوگوں سے انھوں نے پوچھا۔ سب نے میری بات کی ہی تائید کی۔ بھیڑ میں لوگوں نے چلا کر کہا: "تب ہم سب مکان جلا دیں گے۔" ہم نے کہا: "آپ کی مرضی۔" انھوں نے سارے مکانوں میں پٹرول سے آگ لگا دی۔ جب شعلے پوری طرح بھڑک اٹھے تب وہ یہاں سے رخصت ہوئے۔"

میں نے پوچھا: "کلیان سنگھ، تم نے اپنی دو لاکھ کی مالیت خاک میں ملوا دی۔ شاید زندگی بھر کی کمائی۔ اور یہ بتا کیوں نہیں دیا کہ تم ہندو ہو۔"

کلیان سنگھ نے پاس کھڑے ہوئے مسلمانوں سے تعارف کراتے ہوئے کہا: "ہم اور یہ دونوں راجستھان میں سیکر کے ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ پہلے ہم ہندو یہاں آکر بسے اور ہم نے اپنا کاروبار جمایا۔ اس کے برسوں بعد ہمارے مسلم پڑوسیوں نے ہم سے کہا، کیا ہم بھی آپ کے ساتھ وہاں چل سکتے ہیں اور آپ کے زیر سایہ دو روٹی کما سکتے ہیں ؟ ہم نے ہامی بھری۔ وہ ہمارے بھروسے اور اطمینان

پر یہاں آئے۔ اچھے کاری گر اور ہنرمند تھے۔ جلد ہی انھوں نے اپنا کاروبار کھڑا کر لیا اور اپنے گھر بھی بنا لئے۔ تو جن لوگوں سے ہمارے سیکڑوں برس کے تعلقات تھے، جو ہمارے گاؤں کے لوگ تھے، جو ہمارے بھروسے پر یہاں آئے تھے، اور جنھیں ہم چچا، تاؤ، ماموں کہہ کر پکارتے ہیں، اگر ہم اپنے گھر بچا کر ان کے گھر جلوا دیتے تو پھر اوپر والے کو کیسے منہ دکھاتے؟"

میرا دل بھر آیا۔ میں اپنے کو ضبط نہ کر سکا۔ میں نے کہا: "کلیان سنگھ! جب تک تیرے جیسے آدمی ہندستان میں ہیں تو اس ملک سے باہمی محبت اور یک جہتی کی جڑوں کو کوئی ہلا نہیں سکتا۔"

فطرتِ انسانی

کلیان سنگھ نے جو کچھ کیا، اپنی فطرت کی پکار پر کیا۔ ہر آدمی اسی فطرتِ صحیح پر پیدا ہوتا ہے۔ ہر آدمی ابتدائی طور پر اپنی فطرت کے زیر اثر ہی کام کرتا ہے۔ البتہ جب اس کو بھڑکا کر غصہ دلا دیا جائے تو اس وقت اس کی انسانی فطرت دب جاتی ہے اور اس کی حیوانی خصلت ابھر آتی ہے۔ تخریب اور فساد کے تمام واقعات اسی وقت ہوتے ہیں جب کہ انسان کو غصہ دلا کر اس کو اس کی فطرت سے ہٹا دیا گیا ہو۔

جب تک آپ فریق ثانی کو مشتعل نہ کریں، وہ آپ کے لیے "انسان سنگھ" رہتا ہے۔ مگر جب آپ اپنی کسی حرکت سے اس کے اندر اشتعال پیدا کر دیں تو وہ آپ کے لیے "حیوان سنگھ" بن جائے گا۔ اب اس کی گاڑی فطرت کی پٹری سے اتر جائے گی۔ اور جو گاڑی اپنی اصل پٹری سے اتر جائے وہ خود بھی تباہ ہوگی اور دوسرے کے لیے بھی تباہی کا سبب بن جائے گی۔

فریق ثانی کی انسانی فطرت کو جگائیے، اور اس کی حیوانی فطرت کو سویا رہنے دیجئے۔ یہی کامیاب اجتماعی زندگی کا واحد یقینی راز ہے۔

کامیابی کا راز

روزنامہ قومی آواز (۲۱ اپریل ۱۹۹۱) میں مسٹر شتاق احمد، ایڈوکیٹ سپریم کورٹ آف انڈیا کا مراسلہ چھپا ہے۔ اس مراسلہ کا ایک حصہ یہ ہے :

"جس زمانہ میں میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا طالب علم تھا، وہاں کے شعبۂ تاریخ کے کیپٹن افتخار احمد خاں نے اپنی طالب علمی کے زمانہ کا ایک واقعہ سنایا۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ یورپ کے یہودیوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو چکا تھا۔ وہ جرمنی سے بھگائے گئے تھے۔ افتخار احمد خاں صاحب روزانہ یونیورسٹی کیمپس میں دیکھتے تھے کہ طلبہ کا ایک گروہ ہے۔ اس کا انداز دوسرے طلبہ سے مختلف ہے۔ وہ عام طلبہ سے زیادہ مطالعہ کرتا ہے۔ کھانے کے اوقات میں جلدی سے لنچ کر کے وہ مطالعہ میں یا مطالعہ سے متعلق کاموں میں مصروف ہو جاتا ہے۔ ایک دن انھوں نے طلبہ کے اس خاص گروپ سے سوال کیا کہ وہ لوگ کیوں جنون کی حد تک محنت کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک طالب علم نے جواب دیا : دیکھئے، ہم یہودی ہیں۔ ہم کو جرمنی سے جلاوطن کر دیا گیا ہے۔ یہاں ہم اقلیت میں ہیں۔ اس لیے اگر ہمارا حریف خوب ہے تو ہم کو خوب تر ہونا ہے۔ اگر وہ بہت اچھا ہے تو ہم کو اس سے بھی زیادہ اچھا بننا ہے۔

یہودیوں کی ترقی کا راز یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مدمقابل سے زیادہ محنت کر کے امتیازی حیثیت حاصل کرنے کو اپنی زندگی کا شیوہ بنا لیا۔ محنت کرنے کے لیے ذہنی سکون اور یکسوئی چاہیے۔ اور یکسوئی کے لیے اپنے آپ کو چھوٹے بڑے جھگڑوں سے، احتجاجی کیفیت سے، اپنی ناکامی کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہرانے سے اور نعرہ بازی سے الگ رکھنا پڑتا ہے۔ یہودیوں نے اس حقیقت کو جان لیا کہ جب وہ اقلیت میں ہیں تو ان پر ایک بہت بڑی تاریخی اور سماجی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ اکثریت سے دگنا زیادہ محنت کریں (صفحہ ۳)

یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں کامیابی کا واحد راز محنت اور دانش مندی ہے۔ خواہ یہودی ہو یا غیر یہودی۔ کوئی عام امت ہو یا خیر امت، ہر ایک کو ایک ہی امتحان میں کھڑا ہونا ہے۔ یہاں کسی کے لیے کوئی استثناء نہیں۔

اس معاملہ میں یہودیوں کا احساس اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ خود اپنے اداروں میں بھی اپنے نوجوانوں کو رعایت نہیں دیتے، تاکہ ان کا زیادہ محنت کا جذبہ سرد نہ ہونے پائے۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے امریکہ میں سائنس کی تعلیم حاصل کی ہے اور اب وہیں ایک تعلیمی ادارہ میں کام کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ امریکہ میں آپ کی ملاقات کیا کچھ یہودیوں سے ہوئی۔ انھوں نے کہا ہاں۔ خود ہمارے ادارہ میں کئی یہودی کام کر رہے ہیں۔ ہمارا ڈائرکٹر بھی یہودی ہے۔

میں نے پوچھا کہ کہا جاتا ہے کہ یہودی امریکہ میں بہت کامیاب ہیں جب کہ وہ وہاں کی بہت چھوٹی اقلیت ہیں۔ ان کی اس غیر معمولی کامیابی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایک لفظ میں اس کا راز امتیاز (Excellence) ہے۔ انھوں نے امتیازی لیاقت کو اپنا نشانہ بنایا ہے، اور جب امتیازی لیاقت کا درجہ آجائے تو کوئی بھی آپ کی کامیابی کو روک نہیں سکتا۔

انھوں نے مزید کہا کہ امریکہ میں یہودیوں نے جو تعلیمی ادارے قائم کیے ہیں، ان میں انھوں نے بڑا عجیب اصول رائج کیا ہے۔ ان کے تعلیمی اداروں میں غیر یہودی طالب علموں کو اسکالرشپ کا مستحق بننے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ امتحان میں ۴۰ فی صد نمبر حاصل کریں۔ مگر یہودیوں کے لیے ان کا معیار بے حد سخت ہے۔ یہودی طالب علموں کو اسکالرشپ حاصل کرنے کے لیے ۷۵ فی صد نمبر لانا ضروری ہے۔ اگر ان کے نمبر ۷۵ فی صد سے کم ہوں تو ان کو اسکالرشپ (وظیفہ) نہیں دیا جائے گا۔

یہودی خود اپنے اداروں میں ایسا کیوں کرتے ہیں۔ ان کا یہ عمل بظاہر سختی معلوم ہوتا ہے۔ مگر وہ سختی نہیں بلکہ سب سے بڑی ہمدردی ہے۔ اس طرح وہ اپنے نوجوانوں میں محنت کا جذبہ ابھارتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے نوجوانوں میں یہ حوصلہ پیدا کرتے ہیں کہ وہ دوسروں کو پیچھے چھوڑ کر ان سے آگے نکل جائیں۔

موجودہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں جو لوگ رعایت کے طالب ہوں ان کو صرف پچھلی سیٹوں پر جگہ ملتی ہے، اور جو لوگ امتیازی لیاقت کا ثبوت دیں وہ اگلی سیٹوں پر جگہ پانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

کمزور کڑی

زندگی ایک نازک امتحان ہے۔ زندگی کا راز کسی نے تمثیل کے انداز میں ان مختصر لفظوں میں بیان کیا ہے کہ کسی زنجیر کی طاقت اس کی اس کڑی سے جانچی جاتی ہے جو زنجیر کی سب سے کمزور کڑی ہو:

The strength of the chain is tested through its weakest link.

کسی زنجیر میں ایک سو کڑیاں ہوں۔ اس کی ۹۹ کڑیاں مضبوط ہوں۔ صرف ایک کڑی کمزور ہو۔ ایسی زنجیر جب استعمال کی جائے گی تو وہ ۹۹ کڑیوں کی مضبوطی کے باوجود ٹوٹ جائے گی۔ اور اس کے ٹوٹنے کا سبب وہی ایک کڑی ہوگی جس کو مضبوط نہیں بنایا گیا تھا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا حال اسی قسم کی زنجیر جیسا ہو رہا ہے۔ پچھلے سو برس کے اندر مسلمانوں کے درمیان بے شمار رہنما اٹھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو مختلف حیثیتوں سے تیار کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً ــــــ فخر ماضی، قومی تشخص، جذبۂ ملّی، جوش جہاد، شوق شہادت، ولولۂ انقلاب، وغیرہ۔ مگر ایک کام ایسا تھا جو سرے سے انجام نہیں دیا گیا۔ یہ کام تھا، مسلمانوں کو باشعور بنانا۔

باشعور بنانا کیا ہے۔ باشعور بنانا یہ ہے کہ آدمی کو زندگی کی سائنس بتائی جائے۔ اس کو فطرت کے ان قوانین سے باخبر کیا جائے جن کی رعایت کرتے ہوئے اس کو دنیا میں زندگی گزارنا ہے۔ اس کو ان حقائقِ حیات کا علم دیا جائے جن کے بغیر موجودہ دنیا میں کامیاب زندگی کی تعمیر نہیں کی جا سکتی۔ بے شعور آدمی صرف اپنے آپ کو جانتا ہے، باشعور آدمی اپنے ساتھ دوسروں کو بھی جانتا ہے۔ بے شعور آدمی جذباتی ردعمل کے تحت کام کرتا ہے، باشعور آدمی عقلی فیصلہ کے تحت عمل کرتا ہے۔ بے شعور آدمی کا طریقہ غیر منظم ہنگامہ آرائی کا ہوتا ہے، باشعور آدمی کا طریقہ منصوبہ بند اقدام کا۔

موجودہ صدی مسلم دنیا میں تحریکوں کی صدی ہے۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان بے شمار تحریکیں اٹھیں۔ ان تحریکوں نے سب کچھ کیا مگر وہی ایک ضروری کام نہیں کیا جس کو تعمیر شعور کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی یہ بے شعوری ان کی مضبوط زنجیر کی کمزور کڑی ثابت ہوئی۔ جو کچھ انھوں نے دوسرے اعتبار سے بظاہر پایا تھا، وہ عین اسی کمزور کڑی کے مقام پر انھوں نے کھو دیا۔

اس کی ایک مثال ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات ہیں۔ یہ فسادات کوئی استثنائی چیز نہیں ہیں۔ دنیا کے ہر سماج میں وہ اسباب موجود رہتے ہیں جن کو اگر بڑھنے کا موقع دیا جائے تو وہ خوں ریز فساد کی صورت اختیار کر لیں گے۔

ان حالات میں وہی کرنا چاہئے جس کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: ان الفتنة نائمة لعن الله من ایقظها۔ یعنی اسباب فساد کو خوابیدہ حالت میں پڑا رہنے دیا جائے۔ اس کی نوبت نہ آنے دی جائے کہ اسباب فساد بڑھ کر واقعۂ فساد کی صورت اختیار کر لیں۔ انسانی سماج سے فساد کے امکان کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ حسن تدبیر کے ذریعہ ایسا کیا جا سکتا ہے کہ امکان کو واقعہ بننے سے روک دیا جائے۔ تاہم یہ ایک شعوری عمل ہے۔ مسلمان چوں کہ اس معاملہ میں شعور سے بہرہ مند نہ تھے، اس لئے وہ فساد کے خلاف تدبیر کا انداز بھی اختیار نہ کر سکے۔

کسی بستی کے مسلمانوں کو یہ خبر ملتی ہے کہ فریق ثانی ان کے خلاف سازش یا اشتعال انگیزی کر رہا ہے۔ اس قسم کی خبر سننے کے بعد مسلمانوں کے اندر فوری طور پر جو ردعمل ہوتا ہے وہ صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے مقابلہ کے لئے اقدام۔ اس معاملہ میں ان کی بے شعوری اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ ہزاروں بار کے ناکام تجربہ کے باوجود اب تک وہ اپنے اس طریق کار پر نظر ثانی نہ کر سکے۔ یہی تمام فسادات کا خلاصہ ہے۔

اس وقت سب سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ شعور دیا جائے کہ ایسے مواقع پر صحیح طریق کار یہ ہے کہ وہ مقابلہ کے ذہن سے نہ سوچیں بلکہ تدبیر کے ذہن سے سوچیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے یہی طریقہ ثابت ہوتا ہے۔ اور عقل بھی اسی کی صحت کی تصدیق کرتی ہے۔

مسلمانوں کے اندر اگر یہ شعور پیدا ہو جائے کہ اس قسم کی خبر سننے کے بعد وہ مقابلہ کے انداز میں سوچنے کے بجائے حکیمانہ تدبیر کے انداز میں سوچیں تو فسادات کا مسئلہ اس طرح ختم ہو جائے گا جیسے کہ اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

زندگی میں اختلاف اور نزاع کی صورت لازمی طور پر پیش آتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ آدمی اگر باشعور ہو تو وہ معاملہ کو خوش تدبیری کے ذریعہ حل کرے گا۔ اور اگر آدمی باشعور نہ ہو تو وہ جوش اور ردعمل کا مظاہرہ کرے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نشکایت کا ایک معمولی واقعہ بڑھ کر بربادی اور ہلاکت تک پہنچ جائے گا۔ اس کو تقابلی طور پر سمجھنے کے لئے کچھ متعین مثال لیجئے۔

پہلی مثال

محمد نعیم صاحب (پیدائش ۱۹۶۲) راجستھان (گنگا پور) کے رہنے والے ہیں۔ وہ الرسالہ کے قاری ہیں۔ ۲۸ اپریل ۱۹۹۱ کو دہلی میں ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کوٹہ کے فساد (اکتوبر ۱۹۸۸) کی تفصیلات بتائیں۔ انھوں نے کہا کہ کوٹہ میں ہندوؤں کی طرف سے گنیش چترتھی کا جلوس نکالا گیا تھا۔ وہ نعرہ لگاتا ہوا گھنٹہ گھر کے علاقہ میں پہنچا۔ یہ مسلم علاقہ ہے۔ یہاں وہ اشتعال انگیز نعرے لگانے لگے مثلاً ہندستان میں رہنا ہوگا، بندے ماترم کہنا ہوگا۔ اب کچھ مسلمان سڑک پر نکل آئے اور ان کو نعرہ بازی سے روکنا چاہا۔ مگر وہ لوگ نہیں رکے۔ اس کے بعد مزید جھڑپ ہوئی۔ یہاں تک کہ ٹکراؤ کی نوبت آگئی اور پھر باقاعدہ فساد شروع ہوگیا۔ پندرہ مسلمان اس میں مارے گئے اور کروروں روپے کی جائدادیں جلادی گئیں۔

اس کے بعد انھوں اس کے برعکس ایک مثال بتائی۔ انھوں نے کہا کہ کوٹہ کے فساد سے ایک دن پہلے اسی راجستھان کے مقام بارہ میں ہندوؤں نے اسی طرح گنیش چترتھی کا جلوس نکالا۔ یہ جلوس چلتا ہوا مانگرول دروازہ پہنچا۔ وہاں ایک مسجد کے سامنے خوب زور زور سے نعرہ لگانے لگا۔ یہاں بھی وہی نعرہ تھا کہ: ہندستان میں رہنا ہوگا، بندے ماترم کہنا ہوگا۔ مسجد میں نیچے دکانیں ہیں، اوپر مسجد ہے۔ یہاں چھت پر مسلم نوجوانوں کی ایک تعداد جمع ہوگئی۔ وہ لوگ نعرہ کو سن کر غصہ تھے اور جلوس کے خلاف کارروائی کرنا چاہتے تھے۔ محمد نعیم صاحب ایک جماعت کے ساتھ بارہ گئے تھے اور اس وقت مانگرول کی اسی مسجد میں اپنے دس ساتھیوں کے ہمراہ موجود تھے۔ محمد نعیم صاحب فوراً مسلم نوجوانوں کے پاس آئے جو اس وقت جوش میں بھرے ہوئے تھے۔ ان کو مسجد کے اندر لے گئے۔ ان سے کہا کہ آپ غصہ کیوں ہو رہے ہیں۔ ان کا نعرہ لفظ ہی تو ہے۔ وہ کوئی پتھر یا تیر تو نہیں جو آپ کے جسم کو لگ رہا ہو۔ پھر ان لوگوں کو صحابہ کے واقعات سنائے کہ انھوں نے کس طرح صبر کیا۔ اس طرح آدھ گھنٹہ تک انھوں نے مسلم نوجوانوں کو روکے رکھا یہاں تک کہ جلوس چلا گیا۔

ایک ہی واقعہ ایک جگہ فساد بن جاتا ہے اور دوسری جگہ فساد نہیں بنتا۔ اس فرق کا سبب یہ ہے کہ ایک جگہ مسلمانوں نے بے صبری کی، اور دوسری جگہ انھوں نے صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کیا۔ ایک جگہ انھوں نے بم پر بم مارا، اور دوسری جگہ انھوں نے بم کو ڈیفیوز کر دیا۔

دوسری مثال

یہ الور (راجستھان) کا واقعہ ہے جس کو مولانا محمد حنیف صاحب نے دہلی میں دسمبر ۱۹۹۰ میں مجھے بتایا۔ الور کے کچھ فرقہ پرست ہندوؤں نے یہ سازش کی کہ الور میں فساد کیا جائے اور مسلمانوں کو لوٹا اور جلایا جائے۔ یہ واقعہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰ سے کچھ پہلے کا ہے۔

اسی زمانہ میں انھوں نے ایک مقامی ہندی اخبار میں ایک بناوٹی خبر چھپوائی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ خان پور کے علاقہ کے میو وہاں کے ہندوؤں کو دھمکی دے رہے ہیں کہ ۳۰ اکتوبر کو اگر بابری مسجد کو نقصان پہنچا تو ہم تم لوگوں کو ذبح کر دیں گے۔ اس دھمکی کی وجہ سے اس علاقے کے ہندو بھاگ رہے ہیں، حتی کہ ایک ہندو کا نام دے کر کہا گیا کہ فلاں ہندو اسی بنا پر وہاں سے بھاگ کر باہر چلا گیا ہے۔ یہ مسلمان مسجدوں میں ہتھیار جمع کر رہے ہیں۔

یہ خبر ہندی اخبار میں چھپی تو الور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تناؤ کا ماحول پیدا ہو گیا۔ کچھ ہندو لڑکوں نے مظاہرہ کیا۔ اندیشہ ہوا کہ الور میں فساد ہو جائے گا۔

اب ایک صورت یہ تھی کہ الور کے مسلمان "مقابلہ" کے انداز میں سوچتے۔ وہ ہتھیار جمع کرنے میں لگ جاتے۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے بجائے کچھ سمجھ دار مسلمان الور کے دوسرے کئی ہندی اخباروں کے ذمہ داروں سے ملے۔ انھوں نے بتایا کہ فلاں اخبار جھوٹی خبریں چھاپ کر شہر میں فساد کا ماحول پیدا کر رہا ہے، اخبار والوں نے کہا کہ آپ تردید لکھ کر دے دیجئے، ہم اس کو اپنے اخبار میں چھاپ دیں گے۔ مگر یہ مسلمان اس راز کو سمجھتے تھے کہ صرف مسلمان کی تردید اس فضا کو ختم کرنے کے لئے کافی نہیں۔ چنانچہ انھوں نے اصرار کیا کہ آپ خود اپنے اسٹاف کے کچھ لوگوں کو موقع پر بھیج کر براہ راست اس کی تحقیق کرائیں۔ وہ لوگ راضی ہو گئے۔ چنانچہ مسلمانوں نے دو گاڑیوں کا انتظام کیا اور تین ہندی اخباروں کے نمائندوں کو ساتھ لے کر خان پور کے علاقہ میں گئے۔

وہاں انھوں نے تفصیل کے ساتھ حالات کا جائزہ لیا۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں سے ملے۔ ان مسجدوں میں گئے جن کی بابت مذکورہ ہندی اخبار نے کہا تھا کہ وہاں ہتھیار جمع کئے جا رہے ہیں۔ وہ اس ہندو کے گھر بھی گئے جس کی بابت خبر میں بتایا گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کی دھمکی سے خوف زدہ ہو کر اپنے گھر سے بھاگ گیا ہے۔ انھوں نے اس آدمی کے بھائی سے ملاقات کی۔ بھائی نے بتایا کہ دھمکی کی بات

بالکل بے بنیاد ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اس وقت باہر چلا گیا ہے مگر اس کا یہ سفر عارضی طور پر ایک ذاتی سبب کی بنا پر ہے نہ کہ کسی قسم کی دھمکی کی بنا پر۔

ہندی اخباروں کی اس پارٹی نے اپنی ذاتی تحقیق میں یہ پایا کہ مذکورہ خبر سراسر بے بنیاد اور گھڑی ہوئی تھی۔ اس کا کوئی جز بھی سچائی پر مبنی نہ تھا۔ اس کے بعد ان اخباروں کے ہندو نامہ نگاروں نے مفصل رپورٹ مرتب کی اور اس کو اپنے اخباروں میں شائع کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ہم لوگ خود خان پور کے علاقہ میں گئے اور وہاں ذاتی طور پر تمام باتوں کی تحقیق کی اور ہم نے پایا کہ یہ خبر سراسر غلط ہے۔ اس کے بعد تناؤ اور فساد کا ماحول اپنے آپ ختم ہو گیا۔

اب اس کے برعکس مثال لیجئے۔ یہ مثال کانپور سے تعلق رکھتی ہے۔ ۱۷ جنوری ۱۹۹۱ کو میری ملاقات جناب نیاز احمد کانپوری (Tel.213169) سے ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ یوپی میں ہندی کے دو اخبار ہیں، دینک جاگرن، دینک آج۔ ان اخباروں میں باہم مقابلہ جاری رہتا ہے۔ وہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ کوئی سنسنی خیز خبر نکالیں اور اس کو بڑھا چڑھا کر چھاپیں تاکہ ان کا اخبار زیادہ بک سکے۔

دینک جاگرن نے "۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰" سے کچھ پہلے یہ خبر چھاپی کہ کانپور کے مسلمان ہتھیار جمع کر رہے ہیں۔ مسلمان ہندوؤں کے خلاف فساد کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں فرضی طور پر کچھ مسلم محلوں بابو پورہ چمن گنج، فتح فل گنج وغیرہ کا نام بھی چھاپ دیا۔ اس کے فوراً بعد مسلمانوں نے یہ کیا کہ احتجاجی طور پر دینک جاگرن کی کاپیاں لے کر کئی روز تک ان کو سڑکوں پر جلاتے رہے۔ مسلم ہوٹلوں میں دینک جاگرن کا بائیکاٹ کیا گیا، وغیرہ۔

اس سلسلہ میں دو طرفہ طور پر مختلف قصے ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ نام نہاد انصاف پارٹی کے ایک مقامی لیڈر کے کہنے پر مسلمانوں نے "کانپور بند" کی کال دی۔ ۸ دسمبر کو کانپور کے مسلمانوں کی دکانیں بند کرائی گئیں۔ مسلم نوجوانوں نے جلوس نکالے۔ بعض محلوں میں دکانیں بند کروانے کے سلسلہ میں جھڑپیں ہوئیں۔ جلوس کے لوگ تشدد پر اتر آئے۔ اس کے بعد پولیس آئی۔ پولیس نے ہوائی فائر کیا۔ اس کے نتیجہ میں بھگدڑ مچی اور کچھ مسلمانوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ بعد کو جب مسلمان چھوڑے گئے تو مسلمانوں نے دوبارہ جلوس نکالا۔ اس جلوس کے دوران ایک واقعہ پیش آیا جس کے نتیجہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں ٹکراؤ ہو گیا۔ پولیس اور مسلمانوں کے درمیان باقاعدہ لڑائی ہوئی۔ مسلمان اپنی چھتوں پر چڑھ کر پولیس

کے خلاف پتھر اور بم وغیرہ آزادانہ استعمال کرتے رہے۔ یہ واقعہ ۱۱ دسمبر ۱۹۹۰ کا ہے۔

یہ فساد تین دن تک باقاعدہ جاری رہا۔ جناب نیاز احمد صاحب کے بیان کے مطابق ۱۰ مسلمان مارے گئے۔ ۱۰۹ دکانوں اور مکانوں کو جلا دیا گیا۔ وغیرہ۔

وہی واقعہ جو الور میں خوش تدبیری کے نتیجہ میں ایک قطرہ خون بہائے بغیر ختم ہو گیا، وہی واقعہ کانپور میں جان و مال کی تباہی کا سبب بن گیا۔ اور اس کے نتیجہ میں نفرت اور تعصب کا جو زہر مقامی طور پر پھیلا اور پریس کے ذریعہ پورے ملک کے لوگوں کے دلوں میں داخل ہوا، وہ اس کے علاوہ ہے۔

یہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے۔ یہاں ہمیشہ ایسا ہوگا کہ مختلف عنوان سے ایک اور دوسرے کے درمیان نزاع اور کش مکش کی صورتیں پیدا ہوں۔ ایسا ایک خاندان کے افراد کے درمیان بھی ہوگا اور ملک کے مختلف فرقوں کے درمیان بھی۔ ایسے واقعات ایک قومی سماج میں بھی پیش آئیں گے اور دو قومی سماج میں بھی۔

ایسی حالت میں جو لوگ ایسا کریں کہ وہ ہر ناخوشگوار واقعہ پر جھنجلا کر لڑنے لگیں تو وہ صرف اپنی ناکامی کا گڑھا کھودیں گے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ایسے مواقع پر ردعمل کے بجائے حکیمانہ عمل کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ آگ کو بھڑکانے کے بجائے آگ کو بجھانے کی تدبیر کی جائے۔ فساد کے بم پر بم نہ مارا جائے، بلکہ فساد کے بم کو خوش تدبیری سے ڈیفیوز (ناکارہ) کر دیا جائے۔

اس طرح کے معاملات کا یہی ایک واحد حل ہے۔ اس کے سوا ہر دوسرا طریقہ فساد میں اضافہ کے سوا کسی اور انجام تک پہنچنے والا نہیں۔ آج سب سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو باشعور بنایا جائے۔ یہ مسئلہ بے شعوری کے سبب سے پیدا ہوا ہے اور مسلمانوں کو باشعور بنا کر اسے ختم کیا جا سکتا ہے۔

مسائل، مواقع

زندگی میں مسائل بھی ہوتے ہیں اور مواقع بھی، ٹھیک اسی طرح جس طرح گلاب کے درخت میں کانٹے بھی ہوتے ہیں اور پھول بھی۔ ہندستانی مسلمانوں کا یہ المیہ ہے کہ ان کے لکھنے اور بولنے والے طبقہ نے ان کے سامنے صرف مسائل کی مبالغہ آمیز داستان سنائی۔ انھوں نے مسلمانوں کو مواقع سے باخبر نہیں کیا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان خلاف واقعہ طور پر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اس ملک میں ان کے لیے مسائل ہی مسائل ہیں، یہاں ان کے لیے زندگی اور ترقی کے مواقع موجود نہیں۔

یورپ کے سفر میں میری ملاقات ایک ہندستانی مسلمان سے ہوئی۔ وہ ایک یورپی شہر میں ایک انگریزی اخبار کے ادارتی اسٹاف میں تھے۔ انھیں ایک باعزت زندگی حاصل تھی اور ان کے بچے وہاں کے ایک اچھے اسکول میں تعلیم پا رہے تھے۔ ہندستانی مسلمانوں کا ذکر آیا تو میں نے کہا کہ ہندستان کے مسلمانوں کا بنیادی مسئلہ تعلیم ہے۔ تعلیم میں پیچھے ہونے کی وجہ سے وہ ہر شعبہ میں پیچھے ہیں۔ اور اگر وہ تعلیم میں آگے بڑھ جائیں تو اس کے بعد وہ اپنے آپ زندگی کے ہر شعبہ میں آگے بڑھ جائیں گے۔ اس سلسلہ میں تعلیم کی اہمیت بتاتے ہوئے میں نے سابق امریکی صدر لنڈن جانسن کا یہ قول دہرایا :

Learning is the basic to our hopes for America

میری بات سن کر انھوں نے کرسی پر اپنا پہلو بدلا اور بے پروائی کے انداز میں بولے : آپ لرننگ (learning) کی بات کرتے ہیں اور یہاں تو اب ڈی لرننگ (de-learning) کی تحریک چل رہی ہے۔

ان کی بات سن کر مجھے سخت جھٹکا لگا۔ میں نے کہا کہ جناب، یہ بتائیے کہ آپ یہاں جو زندگی حاصل کئے ہوئے ہیں وہ لرننگ کی بنیاد پر ہے یا ڈی لرننگ کی بنیاد پر۔ اور اپنے بچوں کو آپ لرننگ کے ادارہ میں داخل کیے ہوئے ہیں یا ڈی لرننگ کے میدان میں گھومنے کے لیے انھیں چھوڑ دیا ہے۔ میرے اس سوال پر وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

اس طرح کے مسلسل تجربات کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ نام نہاد مسلم دشمن طاقتیں نہیں ہیں بلکہ خود مسلمانوں کے نام نہاد دانشور اور ان کے رہنما ہیں۔ یہ لوگ خود اپنے معاملات نہایت ہوشیاری کے ساتھ حل کئے ہوئے ہیں۔ مگر جب وہ پریس اور پلیٹ فارم سے

مسلمانوں کو خطاب کرتے ہیں تو وہ ان کو اس کے بالکل برعکس چیز کی خبر دیتے ہیں جس کو وہ اپنی ذاتی زندگی میں اختیار کیے ہوئے ہیں۔

ایک علامتی مثال

ہندستان کے ایک مشہور مسلم دانشور کی ایک انگریزی کتاب پنگوئن بکس (Penguin Books) سے چھپی ہے۔ ۴۴۵ صفحہ کی اس کتاب کا نام ہے محمدؐ اور قرآن :

Muhammad and the Quran (1991)

اس کتاب کے آغاز میں ڈیڈیکیشن کا ایک صفحہ شامل ہے۔ اس میں مصنف نے کہا ہے کہ ——— میرے بیٹوں مسٹر اکمل اور مسٹر کمال کے نام، جنھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اس مذہب کے بارہ میں صحیح واقفیت حاصل کریں جن کے اندر وہ پیدا ہوئے ہیں، تاکہ وہ ہارورڈ یونی ورسٹی اور ایل یونی ورسٹی میں اپنے دوستوں سے معلوماتی تبادلہ کر سکیں جہاں اب بھی اسلام کے بارہ میں غلط فہمیاں موجود ہیں۔ بنجمن ڈزرائیلی کے الفاظ میں، وہ اپنی غلط آگہی کی تصحیح کر سکیں :

To my sons, Akmal and Kamal, who wanted to have a correct perception of the religion into which they have been born, so that they could share the knowledge with their friends of Harvard and Yale, where misconceptions about Islam still persist. In the words of Benjamin Desraeli, they may have to 'learn to unlearn.'

اسلام کے بارہ میں دوسروں کی تصحیح فکر کی کوشش قابل قدر ہے۔ تاہم ایک اور معاملہ میں خود مصنف اور ان کے جیسے ہزاروں مسلم دانشور بھیانک غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور انھیں چاہیے کہ وہ اپنی اس غلط فکری کی تصحیح کریں۔ یہ ہندستان میں مسلمانوں کی صورت حال کا مسئلہ ہے جس کے معاملہ میں مصنف سمیت، ہزاروں مسلم دانشور اور رہنما ہلاکت خیز حد تک شدید غلط فکری کا شکار ہیں۔

وہ غلط فکری یہ ہے کہ ان مسلم دانشوروں اور رہنماؤں میں سے ایک ایک شخص ہندستان میں اعلیٰ حیثیت حاصل کیے ہوئے ہے۔ ان کے بیٹے اسی ملک کے حالات میں بڑی بڑی ترقیاں کر رہے ہیں۔ مگر جب مسلم امت کا مسئلہ زیر بحث آتا ہے تو وہ خود اپنی اس دریافت کردہ حقیقت سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ اب اچانک انھیں نظر آنے لگتا ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے لیے تباہی و بربادی کے سوا کوئی اور انجام

نہیں۔ وہ اپنے خاندان کو ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچا رہے ہیں، مگر انھیں نہیں معلوم کہ وہ ملّت کے وسیع تر خاندان کو کس طرح ترقی کا راستہ دکھائیں۔

مذکورہ مسلم دانشور کی مثال لیجئے، ایک طرف ان کا حال یہ ہے کہ ان کے بیٹے، ۱۹۴۷ کے بعد کے ہندستان میں پیدا ہوتے ہیں۔ انھیں یہاں وہ امکانات مل جاتے ہیں جن کو استعمال کر کے وہ بہترین تعلیم حاصل کریں۔ اس کے بعد انھیں مغرب میں مواقع مل جاتے ہیں تاکہ وہاں کی یونی ورسٹیوں میں داخلہ لے کر مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے لیے شاندار مستقبل کی تعمیر کر سکیں۔ مگر انھیں مسلم دانشور کے سامنے جب ملّت کا مسئلہ آتا ہے تو وہ ملّت کے بارہ میں اِن تمام امکانات سے بالکل بے خبر ہو جاتے ہیں۔ اپنے بچّوں کے لیے انھیں اسی ملک میں روشن مستقبل دکھائی دیتا ہے اور قوم کے بچّوں کے لیے صرف تاریک مستقبل۔

یہاں میں مذکورہ مسلم دانشور کے ایک مضمون کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جس کا تعلق ہندستانی مسلمانوں سے ہے اور جو دہلی کے انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (۲۴ نومبر ۱۹۹۱) میں شائع ہوا ہے۔

موصوف اپنے مضمون میں بتاتے ہیں کہ مسلمان اس ملک میں نہایت بری حالت (miserable condition) میں ہیں۔ ہندو فرقہ پرست جماعتوں کی مسلم دشمنی مسلمانوں کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے۔ ان جماعتوں نے اکثریتی فرقہ کے اندر متعصبانہ ذہنیت پیدا کر دی ہے۔ مسلمان سرکاری دفتروں میں جاتے ہیں تو ان کے ساتھ سرد مہری کا سلوک کیا جاتا ہے۔ حکومت کو مسلمانوں کی تباہی و بربادی سے کوئی دل چسپی نہیں۔ اندرا گاندھی کے زمانہ میں گوپال سنگھ کمیشن اور گجرال کمیشن نے اقلیتی مفاد کے لیے سفارشیں پیش کیں مگر اب تک ان کی تعمیل نہ جا سکی۔ فرقہ وارانہ فساد نے مسلمانوں کو عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا کر دیا ہے۔ وغیرہ، وغیرہ۔

مذکورہ دانشور کا پورا مضمون اسی قسم کی مایوس کن باتوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس کو میں نے پڑھا تو بے اختیار میری زبان سے نکلا: کاش یہ دانشور مذکورہ مضمون کے بجائے ایک اور مضمون لکھتے اور اس میں یہ بتاتے کہ ان کے بچّوں نے کس طرح اسی ہندستان میں پڑھ کر اتنی ترقی کی کہ وہ امریکہ کی یونی ورسٹیوں میں پہنچ گئے اور اب وہ شاندار مستقبل کی طرف اپنا سفر طے کر رہے ہیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو وہ ہندستانی مسلمانوں کو زیادہ فائدہ پہنچاتے۔ کیوں کہ اس سے مسلمانوں کو تجرباتی طور پر یہ معلوم ہوتا کہ وہ اس ملک میں اعلیٰ ترین ترقی کر سکتے ہیں۔ مذکورہ مضمون تو انھیں مایوسی کے سوا کوئی اور تحفہ دینے والا نہیں۔

سروے کی ضرورت

ایک صاحب نے ایک مسلم رہنما کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ہندستان میں مسلمانوں کو تباہ کیا جارہا ہے اور یہ عمل ۱۹۴۷ سے نہایت منظم طور پر جاری ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ اس معاملہ کا سروے کیجئے۔ اور سب سے پہلے خود ان رہنما حضرات کا جائزہ لیجئے جو اس ملی حادثہ کی خبر دے رہے ہیں۔ یہ رہنما حضرات بھی مسلم ملّت کا جزء ہیں۔ اس لیے ان کا بھی وہی انجام ہونا چاہیے جو ملّت کے دوسرے افراد کا انجام ہو رہا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ باریش رہنماؤں اور بے ریش رہنماؤں کی ایک فہرست بنائیے۔ اس کے بعد ایک ایک شخص کے بارہ میں پتہ کیجئے کہ ۱۹۴۷ میں اس کی کیا حالت تھی اور آج اس کی کیا حالت ہے۔

آپ معلوم کیجئے کہ ۱۹۴۷ میں ان کی ذات پر ماہانہ کتنا خرچ ہوتا تھا اور آج ان کی ذات پر ماہانہ کتنا خرچ ہوتا ہے۔ ۱۹۴۷ میں ان کے پاس سفر کے لیے کون سی سواری تھی اور آج ان کے پاس سفر کے لیے کون سی سواری ہے۔ ۱۹۴۷ میں وہ کس مکان میں رہتے تھے اور آج وہ اور ان کا خاندان کس مکان میں رہتا ہے۔ ۱۹۴۷ میں سالانہ وہ ہوائی جہاز کا کتنا سفر کرتے تھے اور آج وہ جہاز کا کتنا سفر کرتے ہیں۔ ۱۹۴۷ میں ان کی کتنی کتابیں چھپی تھیں اور اب ان کی کتنی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ۱۹۴۷ میں وہ کتنے اداروں کی صدارت اور نظامت کر رہے تھے اور آج وہ کتنے اداروں کی صدارت اور نظامت کر رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ میں ان کی قومی یا بین اقوامی پوزیشن کیا تھی اور آج ان کی قومی یا بین اقوامی پوزیشن کیا ہے۔

اس سروے میں آپ حیرت انگیز طور پر پائیں گے کہ بلا استثناء ہر رہنما، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، ۱۹۴۷ کے بعد اس نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ پھر جب مسلم رہنما اس ملک میں شاندار ترقیاں حاصل کر رہے ہیں تو عام مسلمان آخر کس بنا پر ترقی سے محروم رہیں گے۔

اصلی سبب

اس عجیب و غریب تضاد کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب بالکل سادہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر سماج میں، خواہ وہ کوئی مسلم سماج ہو یا کوئی مشترک سماج، ہمیشہ دونوں قسم کے حالات موجود رہتے ہیں۔ عُسر کے حالات بھی اور یُسر کے حالات بھی۔ مسائل بھی اور مواقع بھی۔ ایسا قانون فطرت کے تحت ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی بھی سماج کبھی اس سے خالی نہیں ہو سکتا۔

اب نام نہاد مسلم دانشور اور مسلم رہنما یہ کر رہے ہیں کہ جب اپنی ذات کا اور اپنے بیٹوں کا معاملہ ہوتا ہے تو وہ مسائل کو نظر انداز کرتے ہیں اور مواقع کو استعمال کرتے ہیں۔ اور جب وہ ملّت کے مسائل پر بولتے ہیں تو اس کے برعکس وہ ایسا کرتے ہیں کہ مواقع کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور مسائل کو بڑھا چڑھا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان کے اسی تضاد کا یہ نتیجہ ہے کہ ملّت تباہ ہے اور وہ خود ملک میں شاندار ترقیاں حاصل کر رہے ہیں۔

موجودہ دنیا کبھی بے مسائل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ دنیا مواقع حیات سے خالی ہو جائے۔ عقل مند آدمی وہ ہے جو مسائل سے صرف نظر کرے اور مواقع کو بھرپور طور پر استعمال کرے یہی اس دنیا میں کامیابی کا واحد راز ہے۔ جو لوگ اس حکمت کو اختیار کریں وہ اس دنیا میں کبھی تر اور کامیابی سے محروم نہیں رہ سکتے۔

مسلمانوں کے نام نہاد رہنما یہ متضاد رویہ کیوں اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس کی ایک معلوم وجہ ہے۔ اگ وہ مسلمانوں کو وہ آزمودہ تدبیر بتائیں جس سے انھوں نے کامیابی حاصل کی ہے تو ان کو "موافقت" کی زبا بولنی پڑے گی۔ کیوں کہ یہ دراصل موافقت کا طریقہ ہے جس نے ان کو ملک کے اندر اور ملک کے باہر ترقی کے مواقع دے رکھے ہیں۔

مگر انھیں ڈر ہے کہ ایسا کرتے ہی وہ مسلمانوں کے درمیان اپنی قیادت کھو دیں گے۔ کیونکہ مسلمان اپنے موجودہ مزاج کی بنا پر، موافقت کی باتوں کو بزدلی سمجھتے ہیں اور ٹکراؤ کی باتوں کو جہاد۔ مسلمانوں کے درمیان ٹکراؤ کی باتیں کرنے سے لیڈری ملتی ہے۔ اور جو شخص موافقت اور ایڈجسٹمنٹ کی بات کرے وہ فوراً مسلمانوں کی نظر میں غیر مقبول ہو جاتا ہے۔

یہ نام نہاد لیڈر خوب جانتے ہیں کہ ترقی کا راز حالات سے موافقت میں ہے اور وہ اپنی ذات کے معاملہ میں مکمل طور پر اسی طریقہ کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ مگر جب وہ اسٹیج پر آتے ہیں تو وہ ٹکراؤ کی زبان بولتے ہیں تاکہ مسلمانوں کے اندر اپنی مقبولیت کو باقی رکھ سکیں۔

کرنے کا کام

۱۹۹۱ کی بات ہے۔ کچھ مسلم نوجوان میرے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم ایک کانفرنس کرنا چاہتے ہیں، آپ بھی اس میں ہمارا تعاون کیجئے۔ میں نے پوچھا کہ اس کانفرنس کا موضوع (theme) کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ "اقدام امت"۔ میں نے کہا کہ اگر آپ ایک لفظ بدل دیں تو میں آپ کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں۔ انھوں نے پوچھا کہ وہ کیا لفظ ہے۔ میں نے کہا کہ آپ اس کو اقدام امت کانفرنس نہ کہیں بلکہ اس کو تیاری امت کانفرنس کی حیثیت دے دیں۔ انھوں نے اس تبدیلی کو قبول نہیں کیا اور واپس چلے گئے۔

زندگی میں ہمیشہ دو مرحلے ہوتے ہیں۔ ایک تیاری کا مرحلہ، اور دوسرا اقدام کا مرحلہ۔ دوسرا مرحلہ ہمیشہ مرحلۂ اول کے بعد آتا ہے نہ کہ مرحلۂ اول سے پہلے۔ اِس وقت مسلم امت اقدام کے مرحلہ میں نہیں ہے بلکہ وہ تیاری کے مرحلہ (preparatory period) میں ہے۔ مرحلہ کے مطابق کام کرنا عمل ہے، اور مرحلہ کے خلاف کام کرنا صرف وقت اور مال کا ضیاع۔

خدا کا طریقہ یہ ہے کہ جب وہ زمین پر ایک پھل دار درخت اگانا چاہتا ہے تو وہ پھل سے اس کا آغاز نہیں کرتا بلکہ بیج سے اس کا آغاز کرتا ہے۔ وہ بیج سے چل کر بتدریج پھول اور پھل تک پہنچتا ہے۔ اس طرح گویا خدا تمام انسانوں کو فطرت کی زبان میں یہ پیغام دے رہا ہے کہ میرا طریقہ آغاز سے شروع کرنا ہے :

My way is to begin from the beginning.

اس کے برعکس مسلم دانشوروں اور مسلم رہنماؤں کا حال یہ ہے کہ وہ پہلے ہی مرحلہ میں آخری نتیجہ کی طرف چھلانگ لگانا چاہتے ہیں، وہ تیاری کے بغیر اقدام کا نعرہ لگاتے ہیں۔ اس قسم کا ہر مسلمان گویا اپنے عمل کے ذریعہ یہ کہہ رہا ہے کہ میرا طریقہ آخری مقام سے شروع کرنا ہے :

My way is to begin from the top.

یہ طریقہ یقینی طور پر فطرت کے خلاف ہے۔ اور اس دنیا کے بارہ میں خدا کا فیصلہ یہ ہے کہ جو شخص فطرت کے نظام کے مطابق کام کرے وہ کامیاب ہو، اور جو شخص فطرت کے نظام سے مطابقت

نہ کرے وہ ناکام و مراد ہو کر رہ جائے۔ ایسی حالت میں کیوں کر ممکن ہے کہ ہماری کوششیں کامیابی کی منزل تک پہنچ سکیں۔

قرآن میں قوموں کے عروج و زوال کا اصول نہایت واضح طور پر بتا دیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ قومیں خود اپنے عمل کی بنیاد پر اٹھتی ہیں اور اپنی ہی عملی کمزوریوں کی بنا پر تنزل کا شکار ہوتی ہیں۔ قوموں کا ابھرنا بھی داخلی اسباب کے تحت ہوتا ہے اور ان کا گرنا بھی داخلی اسباب کے تحت (ان اللہ لایغیر مابقوم حتی یغیروا ما بانفسھم)

یہ ایک ایسا عالم گیر اصول ہے جس میں کوئی استثنا نہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ سب سے پہلے اپنے آپ کو اس خدائی قانون کا مصداق بنائیں۔ وہ اپنی داخلی اصلاح کے لیے سرگرم ہو جائیں۔ وہ احتجاجِ غیر کے بجائے تعمیرِ خویش کی بنیاد پر اٹھنے کی کوشش کریں۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسری صورت نہیں جو ان کو فلاح اور ترقی کی طرف لے جانے والی ہو۔

مسلمان اپنے قائدین کی رہنمائی میں اب تک جو کچھ کرتے رہے ہیں وہ زیادہ تر مطالبہ، احتجاج اور مظاہرہ کی سیاست ہے۔ انھوں نے اپنے ذاتی استحکام پر توجہ دینے کے بجائے دوسروں سے شکایت پر اپنی ساری توجہ مرتکز رکھی ہے۔ یہ طریقہ سراسر بے فائدہ ہے۔ وہ صرف مسائل کو بڑھانے والا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں مسائل کو حل کرنے والا نہیں۔

یہ دنیا مقابلہ کے اصولوں پر بنائی گئی ہے۔ یہاں کسی شخص یا کسی قوم کا مسئلہ ہمیشہ اس کی داخلی کمی کی بنا پر پیدا ہوتا ہے اور داخلی کمی کو دور کر کے ہی اس کو حل کیا جا سکتا ہے۔ مظاہرہ کی سیاست کا انحصار ہمیشہ خارج پر ہوا کرتا ہے۔ پھر کوئی خارج رخی سیاست کیوں کر کسی قوم کے مسئلہ کو حل کر سکتی ہے جب کہ اس کے مسائل داخل رخی اسباب کے تحت پیدا ہوئے ہوں۔

درخت اپنی ابتدائی صورت میں بیج کا نام ہے۔ جیسا بیج ویسا درخت۔ اسی طرح کسی قوم کا خارجی مقام ہمیشہ اس کے داخلی استحکام کی نسبت سے متعین ہوتا ہے۔ جیسی تیاری ویسی قوم۔ یہ قانون اتنا حتمی اور یقینی ہے کہ اس میں کبھی کوئی استثنا ممکن نہیں۔ وہ اہلِ ایمان کے لیے بھی اتنا ہی قطعی ہے جتنا غیر اہلِ ایمان کے لیے۔ وہ ایک قوم کے لیے بھی اسی طرح درست ہے جس طرح کسی دوسری قوم کے لیے۔

یہاں ۱۰ نکات کی صورت میں ملی تعمیر کا ایک پروگرام درج کیا جاتا ہے۔

دس نکاتی پروگرام

۱۔ مسلمانوں کے اندر ایمانی شعور اور دینی جذبہ پیدا کرنا۔ ان کو اس قابل بنانا کہ وہ اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق کو سمجھیں اور ان کو ذمہ دارانہ طور پر ادا کریں۔

۲۔ مسلمانوں میں اخلاقی بیداری پیدا کرنا۔ ان کے اندر سچائی، امانت داری، انصاف اور شرافت کی صفات ابھارنا تاکہ وہ لوگوں کے درمیان بہتر انسان بن کر رہ سکیں۔

۳۔ مسلمانوں میں باہمی اتحاد کا جذبہ ابھارنا۔ ان کے اندر یہ مزاج پیدا کرنا کہ وہ اختلاف رکھنے کے باوجود لوگوں کے ساتھ متحد ہو کر رہ سکیں۔

۴۔ جھگڑوں کو طے کرنے کے لیے کمیٹیاں بنانا۔ مسلمانوں کو آمادہ کرنا کہ جب بھی کوئی نزاع کی صورت پیدا ہو تو اس کو اپنی کمیٹی کے سامنے لے آئیں اور کمیٹی جو بات طے کرے اس پر وہ راضی ہو جائیں۔

۵۔ فضول خرچی کو روکنا۔ رسموں اور تیوہاروں اور تقریبات میں جو غیر ضروری اخراجات کیے جاتے ہیں ان کو روکنا اور ہر معاملہ میں سادہ طریقہ کو رواج دینا۔

۶۔ مساجد و مدارس کو بہتر بنانا۔ یہ کوشش کرنا کہ وہ ہر اعتبار سے نمونہ کے ادارے بن جائیں اور مسلمانوں کے لیے ہر جگہ حقیقی دینی مرکز کے طور پر کام کرنے لگیں۔

۷۔ مسلمانوں کو تعلیم میں آگے بڑھانا۔ مقامی ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے یہ کوشش کرنا کہ ہر مسلمان ضرور پڑھے۔ پوری قوم صد فی صد تعلیم یافتہ بن جائے۔

۸۔ مسلمانوں کی معاشی حالت کو سدھارنا۔ ان کو ہنر سکھانا۔ ان کو تجارت اور صنعت میں آگے بڑھانے کی تدبیریں اختیار کرنا۔ معاشی مسائل کو درست کرنے کے لیے لوگوں میں یہ ذہن بنانا کہ وہ مطالبہ اور احتجاج کے طریقہ کو چھوڑیں اور تعمیر خویش کے طریقہ کو اختیار کریں۔

۹۔ وقف کی جائدادوں کے بہتر استعمال کی کوشش کرنا۔ ان کو منظم کرنا اور ان کے اوپر تعلیمی اور رفاہی ادارے بنانا، ان کو مسلمانوں کی معاشی اور تعلیمی ترقی کے لیے استعمال کرنا۔

۱۰۔ ملکی سیاست کے طریقہ کو چھوڑ کر مقامی سیاست کے طریقہ کو اختیار کرنا۔ وہ معاملات جن کا تعلق سیاست سے ہوتا ہے، مثلاً قومی جھگڑے، الکشن میں ووٹ دینے کا مسئلہ، اس قسم کے تمام امور مقامی دائرہ میں رکھ کر حل کرنا۔ ان کو ملکی اور عمومی اشو بنانے سے کامل پرہیز کرنا۔

ہندستانی مسلمان

پونہ کے تعلیم یافتہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی طرف سے مجھے دعوت دی گئی کہ میں ۶ نومبر ۱۹۹۱ کو ان کے ایک مشترکہ اجتماع سے خطاب کروں۔ تقریر کا موضوع جو ان کی طرف سے دیا گیا وہ تھا:

مسلمان آزادی کے بعد کے ہندستان میں (Muslims in post-independent India)

مجھے خاص طور پر دو پہلوؤں سے مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لینا تھا۔ معاشی اور مذہبی۔ اپنی عادت کے مطابق، میں نے خالص واقعاتی انداز میں اس موضوع کی تحقیق شروع کر دی۔ مطالعہ اور تحقیق کے بعد مجھ پر ایک نئی حقیقت کا انکشاف ہوا۔ وہ یہ کہ عام خیال کے برعکس، ہندستان میں آزادی (۱۹۴۷) کے بعد مسلمانوں کی حالت پہلے سے کافی بہتر ہوئی ہے۔ میں نے جس مسلمان کا بھی جائزہ لیا اور جس مسلم بستی کے بارہ میں بھی تحقیق کی، تقریباً بلا اختلاف ہر ایک کو پایا کہ اس کی موجودہ حالت اس کی سابقہ حالت سے واضح طور پر بہتر ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے کچھ مسائل ہیں۔ انھیں کچھ مشکلات درپیش ہیں۔ مگر کسی گروہ کی حالت کو جانچنے کے لئے یہ کوئی صحیح معیار نہیں کہ وہ مشکلات و مسائل سے خالی ہو۔ کیوں کہ موجودہ دنیا میں ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔ اس دنیا کے لئے خدا کا قانون یہ ہے کہ یہاں ہمیشہ عُسر اور یُسر دونوں موجود رہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو زندگی کی جدوجہد ہی سرے سے ختم ہو جائے گی۔ اور جس سماج سے زندگی کی جدوجہد ختم ہو جائے وہاں زندہ انسانوں کا باغ نہیں اگتا، بلکہ مردہ انسانوں کا قبرستان وجود میں آتا ہے۔

ایسی حالت میں مسلمانوں کے معاملہ کو کسی خود ساختہ معیار سے جانچا نہیں جا سکتا۔ ان کے معیار کو لازمی طور پر ممکن معیار سے جانچنا ہوگا نہ کہ کسی خیالی معیار سے۔

میں نے اپنی تحقیق میں یہ نہیں کیا کہ مسلمانوں کے اخباروں اور رسائل میں اس موضوع پر جو مضامین چھپے ہیں یا چھپ رہے ہیں ان پر اعتماد کر لوں۔ بلکہ میں نے آزادانہ طور پر خود اپنی واقفیت کے تحت اس کے بارہ میں رائے قائم کرنے کی کوشش کی۔ میری تلاش مجھے اس کے بالکل برعکس نتیجہ تک لے گئی جو عام طور پر ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں ایک مسلمہ کے طور پر دہرائی جاتی رہی ہے۔

میں نے سب سے پہلے مسٹر اور مولوی طبقہ میں ان افراد کو دیکھا جو موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے نمائندہ سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر افراد کو میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر جانتا ہوں۔ میں نے پایا کہ ان میں سے ایک ایک شخص ۱۹۴۷ سے پہلے کے مقابلہ میں آج زیادہ بہتر حالت میں ہے۔ خواہ کوئی باریش قائد ہو یا بے ریش قائد، دونوں بلا استثنا پہلے سے بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔

پھر میں نے اپنے وسیع خاندان کو اور اپنے رشتہ داروں کو دیکھا۔ دوبارہ میں نے پایا کہ یہ تمام لوگ پہلے سے بہت بہتر حالت کے مالک ہیں۔ اس کے بعد میں نے ان شہروں اور بستیوں کے مسلمانوں پر غور کیا جہاں میں کم یا زیادہ مدت تک رہا ہوں یا جہاں میں جاتا رہتا ہوں۔ ان کے بارہ میں بھی تقریباً بلا استثنا میرا مشاہدہ یہ تھا کہ وہ قبل از آزادی کے دور کے مقابلہ میں بعد از آزادی کے دور میں زیادہ بہتر حالت میں نظر آتے ہیں۔

کئی ہفتے تک میں اس موضوع سے تعلق رکھنے والے حقائق کا جائزہ لیتا رہا۔ آخر کار میرے ذہن نے فیصلہ کر دیا کہ ۱۹۴۷ کے بعد کے دور میں مسلمانوں نے واضح طور پر اس ملک میں ترقی کی ہے۔ آج وہ پہلے سے کہیں زیادہ بہتر حالت میں ہیں۔

اس تحقیق کے دوران میں ایک مسلمان سے ملاقات کے لئے گیا۔ وہ ایک گاؤں میں ایک کسان کے گھر پیدا ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے تعلیم حاصل کی اور گزیٹڈ افسر ہو گئے۔ چند سال پہلے اکثر ان سے میری ملاقات ہوتی تھی۔ ہر ملاقات میں وہ یہ شکایت کرتے تھے کہ یہاں بہت زیادہ تعصب ہے۔ یہاں مسلمانوں کے لئے ترقی کے مواقع نہیں۔ مجھ کو دیکھئے، میں کئی سال سے اس محکمہ میں افسر ہوں۔ مگر میری مزید ترقی رکی ہوئی ہے۔ ہندو لابی مجھے آگے بڑھنے نہیں دیتی۔

تین سال کے وقفہ کے بعد میں پتہ کے مطابق، ان کے مکان پر ان سے ملنے کے لئے گیا۔ پہلے وہ ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ اب میں نے دیکھا کہ وہ ایک بہت بڑے بنگلہ میں ہیں۔ پہریدار اور ملازم لگے ہوئے ہیں۔ بنگلہ کے چاروں طرف تقریباً ۱۰ ایکڑ زمین ہے جس میں ہرے بھرے درخت بنگلہ کی شان کو بڑھا رہے ہیں۔ وہاں انھوں نے کئی قسم کی فصل بھی اگا رکھی ہے۔ معلوم ہوا کہ پچھلے دو سال سے وہ ترقی کر کے ایک بڑے عہدہ پر پہنچ چکے ہیں اور عہدہ کی نسبت سے یہ بنگلہ انھیں قیام کے لئے دیا گیا ہے۔

میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک موصوف کے پاس رہا۔ اس پوری مدت میں وہ پر فخر طور پر صرف اپنے بنگلہ ، اپنے عہدہ اور اپنے ساز و سامان کا تذکرہ کرتے رہے۔ چند سال پہلے ہر ملاقات میں وہ اکثریتی فرقہ کے تعصب کا ذکر کیا کرتے تھے۔ موجودہ ملاقات میں وہ صرف اپنی بڑائی کا چرچا کرتے رہے۔

اس تجربہ کے بعد میری سمجھ میں آیا کہ وہ اصل کمی کیا ہے جو لوگوں کو ملک کی حقیقی صورت حال سے بے خبر کئے ہوئے ہے۔ وہ دراصل اعتراف حقیقت کا فقدان ہے۔ ایک شخص کو کوئی برائی پہنچے تو وہ حقیقت حیات کے سبب سے پہنچتی ہے۔ مگر اس کو وہ ہندو تعصب کے خانہ میں ڈال کر شکایت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اور اگر ایک شخص کو کوئی بہتری ملے تو وہ اللہ کا انعام ہوتا ہے جو شکر کا طالب ہوتا ہے۔ مگر وہ اس کو ذاتی کارنامہ سمجھ کر فخر و ناز میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس طرح آدمی دونوں صورت کو اس کے حقیقی زاویہ سے دیکھنے سے محروم رہتا ہے۔ وہ نہ ملے ہوئے کا خوب چرچا کرتا ہے، مگر ملے ہوئے سے دوسروں کو آگاہ نہیں کرتا۔

سروسوں کا مسئلہ

ہندستانی مسلمانوں کی زبوں حالی کو بتانے کے لئے عام طور پر جو چیز پیش کی جاتی ہے وہ سرکاری ملازمتوں کا معاملہ ہے۔ دہلی سے مسلمانوں کا ایک انگریزی ماہنامہ نکلتا ہے۔ وہ اپنے تقریباً ہر اشو میں ایسے اعداد و شمار چھاپتا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان کس طرح سرکاری ملازمتوں میں اپنے عددی تناسب سے کم حصہ پائے ہوئے ہیں۔ دوسرے مسلم اخبارات و رسائل بھی عام طور پر اسی پہلو کو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا مشترک طور پر یہ کہنا ہے کہ مسلمان اس ملک کی سرکاری ملازمتوں میں دو فیصد سے زیادہ نہیں، جب کہ آبادی کی نسبت سے ان کی تعداد اس سے زیادہ ہونی چاہئے۔

مگر اعداد و شمار کی یہ منطق درست نہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلمان کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم میں بہت پیچھے ہیں۔ جب کہ انھیں اداروں کی ڈگریاں سروسوں کے لئے فیصلہ کی اصل بنیاد ہوتی ہیں۔ پھر جو گروہ سروسوں کے لئے مطلوبہ لیاقت میں دوسروں سے پیچھے ہو وہ ان سروسوں میں دوسروں کے برابر کس طرح حصہ پا سکتا ہے۔

مردم شماری کے مطابق، مسلمان اس ملک کی آبادی کا تقریباً بارہ فیصد حصہ ہیں۔ اس تعداد میں تقریباً نصف کے برابر عورتیں شامل ہیں۔ اپنی سماجی روایات کے مطابق، مسلمان اس کو پسند نہیں کرتے کہ ان کے گھروں کی خواتین سرکاری دفتروں میں جاکر کام کریں۔ اس طرح خود مسلمانوں کے اپنے نظریہ کے مطابق، ان کی آبادی کا نصف حصہ سرکاری ملازمتوں کی فہرست سے حذف قرار پا جاتا ہے۔ اب بقیہ چھ فیصد میں اگر تین فیصد کو تعلیم کی کمی کی بنا پر حذف کر دیا جائے تو اس کے بعد دو فیصد کا موجودہ تناسب بہت زیادہ غلط نظر نہیں آئے گا۔

اس سے قطع نظر، جہاں تک مادی خوش حالی کا تعلق ہے۔ سرکاری ملازمت کے شعبہ کو اس کے لیے معیار (کرائیٹیرین) کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس کی کم از کم دو متعین وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ سرکاری ملازمت کا تعلق حکومت سے ہوتا ہے اور حکومت پر قابض افراد ہمیشہ ملازمتوں کی تقسیم میں اپنے سیاسی مفاد کا لحاظ کرتے ہیں۔ حتی کہ یہ حکام اگر مخلص ہوں، تب بھی مختلف ملکی اور بین اقوامی مصالح کی بنا پر انھیں سرکاری ملازمتوں کے سلسلہ میں ایسی پالیسی اختیار کرنی پڑتی ہے جس میں فیصلہ کی بنیاد آبادی میں مختلف فرقوں کا عددی تناسب نہیں ہوتا بلکہ وسیع تر مقاصد کی رعایت ہوتی ہے۔ اس بنا پر یہ صورت حال ہر سماج اور ہر حکومتی نظام میں ہمیشہ موجود رہتی ہے۔

مثال کے طور پر پاکستان کے سندھی مسلمانوں کو یہ شکایت ہے کہ مرکزی حکومت کی سروسوں میں پنجابی مسلمان اپنے عددی تناسب سے بہت زیادہ حصہ پر قابض ہیں اور سندھی مسلمانوں کو ان کے عددی تناسب سے بہت کم حصہ ملا ہے۔ عراق میں بیشتر اعلیٰ سرکاری ملازمتیں صدر صدام حسین کے قبیلہ کے افراد کو حاصل ہیں۔ ایران میں اعلیٰ سرکاری مناصب زیادہ تر شیعہ فرقہ کے افراد کو دئے جاتے ہیں۔ سنی فرقہ کے افراد اس سے بڑی حد تک محروم ہیں۔ لیبیا میں بیشتر حکومتی عہدے قذافی کی پارٹی کے لوگوں کے پاس ہیں۔ دوسرے لوگوں کو حکومتی عہدوں میں بہت کم حصہ ملا ہے۔ یہی حالت بلا استثناء تمام مسلم ملکوں میں کسی ایک یا دوسرے اعتبار سے پائی جاتی ہے۔

انڈیا میں بھی یہ فرق مختلف سطحوں پر موجود ہے۔ مگر یہ فرق صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نہیں ہے بلکہ ہندوؤں اور ہندوؤں کے درمیان بھی ہے۔ مثال کے طور پر اعلیٰ سرکاری ملازمتوں میں برہمن فرقہ کا تناسب دوسرے ہندو فرقوں سے زیادہ ہے۔ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ

ہندی تعلیم یافتہ طبقہ کے مقابلہ میں زیادہ سرکاری عہدوں پر قبضہ کئے ہوئے ہے۔ یہی فرق مسلمانوں کی نسبت سے بھی بعض اسباب کی بنا پر پایا جاتا ہے۔ یہ عمومی طور پر ہر ایک کا مسئلہ ہے نہ کہ صرف مسلمانوں کا مسئلہ۔

دوسرے یہ کہ سرکاری ملازمتوں کا تعلق ملکی انتظام (administrative) سے زیادہ اور معاش سے بہت کم ہے۔ سرکاری ملازمت کا حصہ معاشی تقسیم کے نظام میں چند فیصد سے زیادہ نہیں۔ حصول معاش کا میدان ایک بے حد وسیع میدان ہے۔ کسی گروہ کو اگر سرکاری ملازمتوں میں کم حصہ ملے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ معاشی تقسیم میں بھی اس کا حصہ کم ہوگا۔ سرکاری ملازمت کے باہر بہت سے شعبے پھر بھی اس کے لئے کھلے رہتے ہیں اور عین ممکن ہے ان دوسرے شعبوں میں عمل کرکے وہ اس سے بہت زیادہ پالے جتنا اس کو سرکاری ملازمت میں شرکت کے ذریعہ حاصل ہوتا۔

اس اصول کے حق میں بہت سی تاریخی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اس کی ایک قریبی مثال آزادی سے پہلے ریاست حیدرآباد کا معاملہ ہے۔ آزادی سے پہلے ریاست حیدرآباد میں سرکاری ملازمتیں زیادہ تر مسلمانوں کو دی جاتی تھیں۔ ہندوؤں کا حصہ سرکاری ملازمت کے شعبہ میں بہت کم تھا۔ اس کے باوجود ریاست حیدرآباد کے ہندو معاشی کے شعبوں میں ریاست کے مسلمانوں سے بدرجہا زیادہ بہتر تھے۔ کیوں کہ وہاں کے ہندو ریاست کی بیشتر تجارتوں پر قابض ہوگئے تھے۔ انھوں نے تجارت کے ذریعہ اس سے زیادہ معاشی فائدہ حاصل کرلیا جتنا انھوں نے سرکاری ملازمت کے شعبہ میں کھویا تھا۔

مذکورہ اسباب کی بنا پر میرا یہ کہنا ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کی معاشی حالت کو جانچنے کے لئے ہمیں ان کی واقعی معاشی حالت کو دیکھنا چاہئے نہ کہ سروسوں میں ان کے عددی تناسب کو۔ سرکاری سروسوں میں تناسب کو اس معاملہ میں نمائندگی کا درجہ حاصل نہیں۔

مادی کامیابی

میں اتر پردیش کا رہنے والا ہوں۔ ہمارے خاندان کی ایک شادی کی تقریب ۱۹۸۷ء میں بمبئی میں ہوئی۔ اس تقریب میں خاندان کے پچاس سے زیادہ آدمی شریک ہوئے۔ یہ سب کے سب بنارس سے ہوائی جہاز کے ذریعہ سفر کرکے بمبئی پہنچے تھے۔ میں بھی انھیں میں سے ایک تھا۔

ہم لوگ بمبئی کے ایک ہوٹل میں ٹھہرائے گئے۔

اس قیام کے دوران ایک بار میرے ایک عزیز میرے ہوٹل کے کمرہ میں آئے۔ ان کے ہاتھ میں بمبئی کے ایک صاحب خالد لطیف گابا (۱۹۸۱ - ۱۸۹۹) کی ۳۹۰ صفحہ کی ایک کتاب تھی۔ اس کتاب کا نام منفعل آوازیں (Passive Voices) ہے اور وہ پہلی بار ۱۹۷۵ میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب۔ آزادی کے بعد ہندستانی مسلمانوں کی حالت کے بارہ میں ہے۔ کتاب کے نام سے ظاہر ہے کہ مصنف کے نزدیک ہندستانی مسلمان سراسر مظلومی کی حالت میں ہیں۔ انھوں نے کتاب کے نام کی توجیہہ کرتے ہوئے کتاب کے دیباچہ میں یہ الفاظ لکھے ہیں:

It would be difficult to sum up the status and conditions of Muslims in India better in two words than 'Passive Voices.'

میرے مذکورہ عزیز نے کتاب کے مندرجات سے اتفاق کرتے ہوئے ہندستانی مسلمانوں کی مظلومیت بیان کرنا شروع کیا۔ میں نے کہا کہ میری رائے آپ کی رائے کے بالکل برعکس ہے۔ میرے نزدیک ہندستان کے مسلمان آزادی کے بعد پہلے سے بہت بہتر ہو گئے ہیں۔ موجودہ مسلمانوں کا کیس مظلومیت کا کیس نہیں ہے بلکہ ترقی کا کیس ہے۔

میرے عزیز تعجب کے ساتھ میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے کہا کہ آپ کو تعجب اس لئے ہو رہا ہے کہ آپ مسلمانوں کی حالت کو اخباروں میں پڑھتے ہیں۔ خود مسلمانوں کو دیکھ کر مسلمانوں کی حالت کے بارہ میں رائے قائم نہیں کرتے۔ اور ہمارے اخبارات سب کے سب زرد صحافت (yellow journalism) کے اصول پر چلائے جا رہے ہیں۔ وہ پوری صورت حال کو جیسا ہے ویسا بیان نہیں کرتے۔ بلکہ صرف بعض سنسنی خیز پہلو کو لے کر ان کو نمایاں کرتے رہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ خود اپنے آپ کو دیکھئے۔ آج آپ کی جو معاشی اور سماجی حالت ہے وہ اس سے بہت بہتر ہے جو ۱۹۴۷ کے انقلاب کے وقت آپ کی معاشی اور سماجی حالت تھی۔ آج آپ کوٹھی اور کار کے مالک ہیں، حالاں کہ پہلے آپ کے پاس بائیسکل کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

۱۹۸۷ میں ہمارے خاندان کے پچاس افراد ہوائی جہاز سے سفر کر کے بمبئی میں تقریب نکاح میں شرکت کے لئے آئے ہیں۔ حالاں کہ میں اور آپ دونوں جانتے ہیں کہ ہمارا خاندان ۱۹۴۷ میں اس پوزیشن میں نہ تھا کہ وہ اتنے اعلیٰ معیار پر شادی کی تقریب کر سکے۔ ۱۹۴۷ سے

پہلے ہمارے وسیع خاندان اور ہمارے تمام رشتہ داروں کے درمیان صرف ایک موٹر کار تھی، آج صرف ہمارے خاندان اور رشتہ داروں کے پاس دو سو سے زیادہ کاریں موجود ہیں۔ وغیرہ۔

آپ کسی بھی مسلم خاندان کا سروے کیجئے۔ اور پتہ کیجئے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے اس کی سماجی اور اقتصادی حالت کیا تھی اور آج کیا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ تقریباً ہر مسلم خاندان نے نمایاں ترقی کی ہے۔ پہلے اگر وہ بائیسکل والا تھا تو آج وہ کار والا ہے۔ پہلے اگر اس کے پاس چھوٹا مکان تھا تو اب اس کے پاس بڑا مکان ہے۔ پہلے وہ صرف پبلک کال آفس سے ٹیلی فون کر سکتا تھا تو آج اس کے گھر پر خود اپنا ٹیلی فون لگا ہوا ہے۔ پہلے اس کا خاندان صرف محدود مقامی ذرائع پر انحصار کرتا تھا تو آج اس کے خاندان کے کئی افراد باہر کی دنیا میں جاکر بڑی بڑی حیثیت حاصل کئے ہوئے ہیں۔ وغیرہ

یہ میں کوئی انوکھی بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کا تجربہ ہر آدمی اپنے قریبی مسلمانوں کا سروے کر کے معلوم کر سکتا ہے۔ کسی بھی مقام پر جاکر وہاں کے مسلمانوں سے ملئے اور دریافت کیجئے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے ان کی اقتصادی حالت کیا تھی اور آج کیا ہے۔ آپ پائیں گے کہ تقریباً ہر مسلم خاندان کی حالت پہلے سے کہیں زیادہ بہتر ہو چکی ہے۔

یہاں تک کہ مسلمانوں کے وہ لکھنے اور بولنے والے لوگ جو اس اعلان کے چمپئن بنے ہوئے ہیں کہ آزادی کے بعد مسلمان اس ملک میں ایک تباہ حال قوم بنا دئے گئے ہیں۔ آپ ان کے ذاتی حالات کا پتہ کیجئے۔ آپ دیکھئے کہ وہ اور ان کی اولاد آج کس حال میں ہیں۔ آپ یقینی طور پر پائیں گے کہ ان میں سے ہر شخص پہلے سے سو گنا زیادہ بہتر ہو چکا ہے۔ میں ذاتی طور پر ان قائدین میں سے کئی افراد کو جانتا ہوں جو ۱۹۴۷ سے پہلے ایک معمولی خاندان سے تعلق رکھتے تھے آج وہ اور ان کے بچے اسی ملک میں ہر قسم کے مادی ساز و سامان کے ساتھ شاندار زندگی گزار رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کہنا کہ مسلمان آزادی کے بعد پستی میں ڈال دئے گئے ہیں، ایک قسم کی خلاف زمانہ بات (anachronic statement) ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج ہم صنعتی دور (industrial age) میں ہیں۔ صنعت و تجارت کی ترقی نے کمائی کے بے حساب نئے طریقے پیدا کر دئے ہیں۔ موجودہ دور صنعت اور روزگار کے انفجار (explosion) کا دور ہے۔ اس کے بعد یہ

بالکل ناممکن ہو چکا ہے کہ کوئی قوم کسی دوسری قوم کی معاشی ترقی کو روک سکے۔

قدیم زرعی دور میں کسب معاش کے ذرائع بے حد محدود تھے۔ صرف چند سادہ قسم کے کاروبار تھے جن میں مشغول ہو کر کوئی شخص اپنے لئے مختصر آمدنی کر سکتا تھا۔ مگر صنعتی انقلاب نے کمائی کی صورتوں میں ناقابل بیان حد تک اضافہ کر دیا ہے۔ آج صنعت و حرفت کی اتنی زیادہ قسمیں ظہور میں آچکی ہیں کہ ملین اور بلین کے الفاظ بھی اس کی تعداد کو بتانے کے لئے ناکافی ہیں۔

صنعتی انقلاب کے دور میں روزگار کے پھیلاؤ کی بنا پر اب یہ سرے سے ممکن ہی نہیں رہا ہے کہ کوئی قوم یا حکومت کسی گروہ کو خوشحال بننے سے روک سکے۔ آج کسی شخص یا گروہ کی اپنی بے عملی یا نادانی تو اس کو محروم کر سکتی ہے، مگر کوئی خارجی طاقت اس کو محروم کرنے پر قادر نہیں۔

ایک تقابلی مثال اس معاملہ کو مزید واضح کرتی ہے۔ رومن ایمپائر جو آٹھویں صدی قبل مسیح میں شروع ہو کر پانچویں صدی عیسوی میں ختم ہو گئی اور اس کی مشرقی شاخ (بازنطینی ایمپائر) جو ساتویں صدی عیسوی تک طاقت و حالت میں باقی رہی، اس سلطنت کے ایک ہزار سال سے زیادہ مدت میں ان کی پالیسی یہ تھی کہ ان کی ماتحت قومیں سائنسی علوم میں ترقی نہ کر سکیں۔ کیوں کہ سائنسی ترقی کو وہ اپنی سلطنت کے لئے خطرہ سمجھتے تھے۔ رومی حکمراں اپنے اس منصوبہ میں کامیاب رہے اور ان کے طویل دور حکومت میں ان کی ماتحت قوموں کی ترقی نہ ہو سکی۔

اس کے برعکس بیسویں صدی کے وسط میں دوسری عالمی جنگ ہوئی۔ اس کے بعد امریکہ جاپان کے اوپر قابض ہو گیا۔ امریکہ نے بھی چاہا کہ وہ ہمیشہ کے لئے جاپان کو اپنا محکوم بنائے رہے۔ وہ وہاں ایسی کوئی ترقی نہ ہونے دے جو امریکہ کے لئے چیلنج کے ہم معنی بن جائے۔ مگر امریکہ اپنے اس منصوبہ میں کامیاب نہ ہو سکا۔ صرف چالیس سال کی مدت میں جاپان ایک صنعتی اور اقتصادی دیو کی صورت میں ظاہر ہو گیا جو امریکہ کے لئے کمیونسٹ حکومتوں سے بھی زیادہ بڑا خطرہ تھا۔

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ رومن ایمپائر کو صنعتی انقلاب سے پہلے کام کرنے کا موقع ملا۔ اور امریکی ایمپائر کو صنعتی انقلاب کے بعد۔ صنعتی انقلاب سے پہلے ذرائع کی محدودیت کسی حکمراں کو اس قسم کا موقع دے دیتی تھی کہ وہ ایک قوم کی ترقی کو روک سکے۔ مگر صنعتی انقلاب کے بعد ذرائع کی غیر معمولی کثرت نے اس قسم کے امکان کو آخری حد تک ختم کر دیا ہے۔ آج اگر کوئی حکومت کسی قوم کے اوپر ترقی کے

ایک سو دروازے بند کرے تو وہاں ترقی کے مزید ایک ہزار دروازے کھلے ہوئے ہوں گے۔ جن سے وہ قوم اپنا راستہ پالے گی اور ترقی کی طرف اپنا سفر شروع کر دے گی۔ کہیں ایک چھوٹا چشمہ ہو تو اس کے بہاؤ کو روکا جا سکتا ہے۔ مگر پانی جب سیلاب کی صورت اختیار کر لے تو اس کے بعد اس کے طوفان کو روکنا کسی کے لئے ممکن نہیں رہتا۔

مذہبی حالت

یہ عام معاشی حالت کی بات تھی۔ اب مذہبی اعتبار سے دیکھئے۔ ستمبر ۱۹۹۱ میں ایک ہفتہ کے لئے میں لاہور میں تھا۔ وہاں ہر روز صبح کو پہلی آواز جو میرے کان میں آتی تھی وہ مسجد کی اذان کی آواز تھی جو لاؤڈ اسپیکر پر بلند ہو کر پوری فضا میں پھیل جاتی تھی۔ ٹھیک یہی صورت حال انڈیا میں بھی ہے۔ دہلی میں میں نظام الدین کالونی میں رہتا ہوں۔ یہاں ہر روز صبح کے سناٹے کو جو چیز توڑتی ہے وہ دوبارہ اذان کی آواز ہے جو نظام الدین کی مسجدوں سے لاؤڈ اسپیکر پر بلند ہوتی ہے اور کئی کیلومیٹر تک کی فضا اس سے گونج اٹھتی ہے۔ یہی ملک کے تمام شہروں اور قصبوں کا حال ہے۔

لاہور میں بادشاہی مسجد کے اونچے مینار تھے تو بھوپال کی تاج المساجد کے مینار اس سے بھی زیادہ اونچے ہیں۔ اس کے علاوہ انڈیا میں تین لاکھ سے زیادہ مسجدیں ہیں، اور ان میں سے بہت سی مسجدیں وہ ہیں جو ۱۹۴۷ کے بعد کے دور میں بنی ہیں، اور مزید توسیع و ترقی تو تقریباً ہر مسجد کی ہوئی ہے۔ اسلام آباد میں اگر جامعہ اسلامیہ ہے تو دہلی میں حکیم عبد الحمید صاحب کا قائم کردہ عظیم اسلامی ادارہ جامعہ ہمدرد ہے جو کسی بھی مسلم ملک کے اس قسم کے ادارہ سے کم نہیں۔ انڈیا میں مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ اسی طرح ترقی کر رہے ہیں جس طرح پاکستان میں کوئی اسلامی تعلیمی ادارہ ترقی کر سکتا ہے۔

آج لاکھوں کی تعداد میں سارے ملک میں اسلامی مدرسے پھیلے ہوئے ہیں۔ پرانے مدرسے مثلاً ندوہ اور دیوبند ۱۹۴۷ سے پہلے معمولی مدرسے کی طرح تھے۔ آج وہ اپنی وسعت کے اعتبار سے یونیورسٹی کی مانند نظر آتے ہیں۔ آپ کے پڑوس مالیگاؤں میں ایک نیا بہت بڑا مدرسہ جامعہ محمدیہ کے نام سے قائم ہوا ہے جو رقبہ اور عمارت کے اعتبار سے قدیم مدارس سے بھی زیادہ بڑا ہے۔ اس طرح سیکڑوں کی تعداد میں بہت بڑے بڑے نئے مدرسے سارے ملک میں قائم کئے گئے

ہیں۔ رام پور میں جامعۃ الصالحات کے نام سے مسلم لڑکیوں کا مدرسہ قائم ہوا ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ پوری مسلم دنیا میں وہ مسلم لڑکیوں کا سب سے بڑا مدرسہ ہے۔ اس طرح مختلف قسم کے اسلامی ادارے ہزاروں کی تعداد میں یہاں قائم ہوئے ہیں اور آزادی کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔

تبلیغی جماعت مسلمانوں کی ایک مذہبی جماعت ہے۔ اس کا پھیلاؤ ۱۹۴۷ سے پہلے جتنا تھا۔ اس کے مقابلہ میں آج وہ سیکڑوں گنا زیادہ بڑھ چکی ہے۔ دوسری مسلم جماعتوں میں بھی اسی طرح اپنے سرمایہ (asset) اور اپنے پیروؤں کے اعتبار سے بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ انڈیا میں آج ہر دن مسلمانوں کی بڑی بڑی کانفرنسیں اسلام کے مختلف موضوعات پر ہو رہی ہیں۔ جب کہ پہلے اس قسم کی کانفرنسوں کا انعقاد بہت کم ہوتا تھا۔ اسلامی کتابیں اور اسلامی جرائد آج پہلے سے بھی زیادہ شائع ہو رہے ہیں۔ وغیرہ

صحافت وقیادت

۱۹۴۷ کے بعد انڈیا میں جو بری چیز ظہور میں آئی ہے وہ حقیقۃً مسلمانوں کی مظلومی نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی فرضی مظلومی کو بیان کرنے والی صحافت اور قیادت ہے۔ اس ملک میں مسلمانوں کے لئے اگر کوئی خطرہ ہے تو وہ اسی نام نہاد صحافت وقیادت کا وجود ہے، اس کے علاوہ یہاں مسلمانوں کے لئے اور کوئی حقیقی خطرہ نہیں۔

آج مسلمانوں کی صحافت اور قیادت جن افراد کے ہاتھ میں ہے وہ بدقسمتی سے سطحی قسم کے لوگ ہیں۔ انھوں نے اپنی صحافت اور قیادت کو کامیاب بنانے کا یہ سستا نسخہ اختیار کیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے اندر خطرہ کی نفسیات (fear psychosis) پیدا کر کے ان کا استحصال کریں۔ چنانچہ وہ موجودہ ہندستانی سماج سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کچھ برے واقعات نکالتے ہیں اور ان کو مبالغہ آمیز انداز میں پیش کر کے مسلمانوں کو غلط طور پر یہ تاثر دیتے ہیں کہ تم ہندستان میں ظلم و زیادتی کا شکار ہو رہے ہو۔

اس کی ایک مثال بمبئی کا فروری ۱۹۸۹ کا فساد ہے۔ بمبئی کے کچھ لیڈروں نے مقامی مسلمانوں کو اکسایا۔ چنانچہ انھوں نے برطانی شہری سلمان رشدی کی کتاب (The Satanic Verses) کے خلاف بمبئی میں ایک بڑا جلوس نکالا۔ جلوس کے نتیجہ میں فضا خراب ہوئی۔ یہاں تک کہ پولیس نے گولی

چلائی۔ کچھ مسلمان ناحق طور پر ہلاک ہو گئے۔ مسلمانوں کو مالی نقصان بھی پہنچا۔ مسلم اخباروں میں پولیس کے مظالم کی داستان ہفتوں اور مہینوں تک چھپتی رہی۔

یہ المیہ صرف ہماری صحافت اور قیادت کی استحصال پسندی کی وجہ سے پیش آیا۔ جیسا کہ معلوم ہے۔ راجیو گاندھی کی قیادت میں انڈیا پہلا ملک تھا جس نے اکتوبر ۱۹۸۸ میں سلمان رشدی کی مذکورہ کتاب پر پابندی لگادی۔ حتی کہ پاکستان سے بھی پہلے اس نے اس کتاب کی اشاعت وتقسیم کو انڈیا میں قانونی طور پر روک دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس کے بعد انڈیا میں اس مسئلہ پر احتجاجی جلوس کا کیا مطلب ہے۔ اس کے بعد تو انڈیا میں شکر کا جلسہ ہونا چاہئے۔ مسلمانوں کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ وہ ایک ایسے ملک میں ہیں جو ایک اسلام دشمن کتاب پر مسلم ملکوں سے بھی پہلے پابندی لگاتا ہے۔ نہ کہ اس پر احتجاجی جلوس نکالا جائے اور غیر ضروری طور پر اپنے لئے ایسے مسائل پیدا کئے جائیں جن کا باعتبار واقعہ کوئی وجود نہیں۔

قومی ترقی میں حصہ

اوپر کی تفصیلات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آزادئ ہند سے پہلے کے دور کے مقابلہ میں آزادئ ہند کے بعد کے دور میں مسلمان ترقی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ تاہم اس موضوع کا ایک اور پہلو ہے۔ اور وہ یہ کہ مجموعی قومی ترقی (total national growth) میں ان کا حصہ کتنا ہے۔ یہاں میں یہ اعتراف کروں گا کہ اس دوسرے اعتبار سے مسلمان یقینی طور پر پیچھے ہیں۔ مثلاً صحافت اور تعلیم کے اداروں میں ان کا حصہ دوسرے فرقوں کے اعتبار سے بہت کم ہے۔ صنعت اور تجارت کے میدان میں وہ ہندو اور جینی اور پارسی کے مقابلہ میں ابھی تک پیچھے ہیں۔

مگر اس معاملہ میں ہمیں حقیقت پسندانہ رائے قائم کرنا چاہئے نہ کہ کوئی جذباتی رائے۔ اصل یہ ہے کہ زمانی اعتبار سے خوش حال ہونے کے لئے تو زمانی عوامل ہی کافی تھے۔ چنانچہ زمانی اسباب کے تحت مسلمانوں کو موجودہ دور میں خوش حالی کا ایک حصہ مل گیا۔ مگر دوسری ہمسایہ قوموں کے مقابلہ میں اپنا تناسب حصہ پانے کے لئے قومی اہلیت کا ثبوت دینا تھا۔ یہاں رہنماؤں کی غلط رہنمائی اس میں مانع بن گئی کہ مسلمان ملک کی قومی ترقی میں اپنا وہ حصہ پا سکیں جو اپنی عددی طاقت کی نسبت سے انھیں ملنا

چاہیئے تھا۔

مسلمانوں کی قیادت نے خاص طور پر دو پہلوؤں سے مسلمانوں کو نہایت شدید نقصان پہنچایا ہے۔ ایک یہ کہ انھوں نے اپنی نااہلی کی بنا پر مسلمانوں کو جدید تعلیم میں پیچھے کر دیا۔ جب کہ جدید تعلیم موجودہ زمانہ میں ہر قسم کی ترقیوں کی واحد لازمی شرط بن چکی ہے۔

مسلم قیادت کی دوسری شدید تر نااہلی یہ ہے کہ وہ اپنی غلط پالیسی کی بنا پر مسلمانوں کو فسادات کی مصیبت میں الجھائے ہوئے ہیں۔ آزادی کے بعد ہندستان میں چھوٹے بڑے تقریباً چالیس ہزار فساد ہو چکے ہیں۔ اور ان سب کی اصل ذمہ داری بلاشبہ نااہل مسلم قیادت پر ہے۔ ان فسادات کی بنا پر ہی یہ المیہ پیش آیا کہ مسلمان قومی ترقی میں اپنا قرار واقعی حصہ پانے سے محروم رہے۔ اور جو کچھ پایا تھا اس کا بھی ایک حصہ وہ بار بار کھوتے رہے۔

تعلیم کا میدان

۱۹ ویں صدی کے وسط میں یہ واقعہ ہوا کہ برطانی حکومت نے انگریزی تعلیم کو باقاعدہ طور پر ملک میں رائج کیا اور فارسی کے بجائے انگریزی کو ملک کی سرکاری زبان کی حیثیت دے دی۔ اس وقت مسلم قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی وہ انگریزوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ اس نفرت کو وہ یہاں تک لے گئے کہ انھوں نے انگریز اور انگریزی میں فرق نہیں کیا۔ وہ بیک وقت انگریزی قوم اور انگریزی زبان اور علوم دونوں کے دشمن بن گئے۔

مسلم قیادت کے اس مزاج کا اثر مسلم عوام پر پڑا۔ مسلمان عام طور پر انگریزی زبان اور انگریزی میں پڑھائے جانے والے علوم سے متنفر ہو گئے۔ حتی کہ سرسید (۱۸۹۸-۱۸۱۷) نے جب انگریزی تعلیم پر زور دیا تو ان کو انگریزوں کا ایجنٹ بتا کر ان کی سخت مخالفت کی گئی۔ ان کو مسلم عوام سے کاٹ دیا گیا۔ اس بنا پر مسلمان دوسرے فرقوں کے مقابلہ میں انگریزی تعلیم میں تقریباً ایک سو سال پیچھے ہو گئے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ہمارے یہاں عربی زبان میں عالمی سطح کے علماء موجود ہیں مگر انگریزی زبان میں ہمارے پاس ملکی سطح پر بھی کوئی قابل ذکر مسلم رائٹر موجود نہیں۔

تاہم ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد حالات کے زیر اثر مسلمانوں کے اندر نیا ذہن پیدا ہوا ہے۔ اب مسلمان تیزی سے جدید تعلیم کے میدان میں داخل ہو رہے ہیں۔ چنانچہ آج ہمارے یہاں

ڈاکٹر خلیل اللہ جیسے میڈیکل اکسپرٹ اور پروفیسر خسرو جیسے ماہر معاشیات پیدا ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں میں مسٹر رضوی اور مسٹر سبحانی جیسے نوجوان ابھر رہے ہیں جنھوں نے آئی اے ایس کے مقابلہ میں پورے ملک میں ٹاپ کیا ہے۔ وغیرہ

فرقہ وارانہ فسادات

دوسرا مسئلہ فرقہ وارانہ فسادات کا ہے۔ ان فسادات نے مسلمانوں کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ان فسادات کا تعلق ہندستان کے موجودہ نظام سے نہیں ہے بلکہ ان کا تعلق خود مسلمانوں کی زردقیادت اور زرد صحافت سے ہے۔ یہ دراصل ہماری نام نہاد صحافت و قیادت ہے جو فرقہ وارانہ فساد کی اصل ذمہ دار ہے۔

ان فسادات کی منطق کیا ہے۔ اس کے لئے میں دوبارہ آپ کے پڑوسی شہر بمبئی کی مثال دوں گا۔ آزادئ ہند سے تقریباً ۲۰ سال پہلے بمبئی میں ہندوؤں کا ایک جلوس نکلا۔ یہ جلوس چلتا ہوا ایک خاص سڑک پر پہنچا جہاں ایک مسجد واقع ہے۔ مسجد کے متولی کو مسجد کے سامنے ہندو جلوس گزارنے پر اختلاف ہوا۔ متولی نے روکا۔ جب جلوس والے نہیں رکے تو اس نے بمبئی کی عدالت میں اس کے خلاف کیس کر دیا۔ متولی کا یہ مطالبہ تھا کہ عدالت یہ حکم جاری کرے کہ آئندہ کوئی ہندو جلوس اس کی مسجد کے سامنے سے نہیں گزرے گا۔

اس وقت بمبئی میں ایک مسلمان وکیل تھے۔ انھوں نے اس کیس میں مسلم متولی کی طرف سے پیروی کی۔ انگریز جج نے یہ حکم جاری کر دیا کہ مذکورہ مسجد کے پاس یہ نوٹس لگا دی جائے کہ آئندہ کوئی ہندو جلوس اس مسجد کے سامنے سے نہیں گزارا جائے گا۔ مسلمان وکیل کی اس کامیاب پیروی پر مسلمان خوش ہو گئے۔ ان کو اتنی مقبولیت ہوئی کہ وہ مسلمانوں کے عظیم لیڈر بن گئے۔

مگر یہ قیادت نہیں تھی بلکہ غلط رہنمائی تھی۔ مذکورہ مسلمان وکیل کو مسلمانوں سے یہ کہنا چاہئے تھا کہ جلوس کے مسئلہ کا حل جلوس کو روکنا نہیں ہے بلکہ اس کو نظر انداز کرنا ہے۔ تم اپنا الگ ملک بناؤ گے تو وہاں بھی مختلف لوگ جلوس نکالیں گے۔ پھر تم کیا کرو گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں مسلمانوں کے لئے انتخاب جلوس اور بے جلوس میں نہیں تھا۔ بلکہ جلوس اور فساد میں تھا۔ مگر مسلمانوں کی زرد قیادت اور ان کی زرد صحافت مسلمانوں کو یہ رہنمائی نہ دے سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جلوس کو روکنے کی کوشش

میں جگہ جگہ فساد ہونے لگے۔ جو آج تک جاری ہیں۔ اسی بنیاد پر ہندستان میں بھی فساد ہو رہا ہے اور اسی بنیاد پر پاکستان میں بھی۔

اس مسئلے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ۲۵ سال پہلے میں نے ایک تعمیری مہم شروع کی۔ میں نے مسلمانوں کے اندر یہ ذہن پیدا کرنے کی کوشش کی کہ فرقہ وارانہ فساد کا حل جلوس کو روکنا نہیں ہے بلکہ جلوس کو نظر انداز کرنا ہے۔ ۲۵ سالہ کوشش کے بعد اب خدا کے فضل سے اس کے اثرات ظاہر ہو رہے ہیں۔ انڈیا میں سیکڑوں مقامات پر صرف اس لئے فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا کہ مسلمانوں نے اپنے نئے ذہن کے تحت جلوس کو روکنے کے بجائے ان سے اعراض کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ اس کی کچھ مثالیں پچھلے صفحات میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلہ میں مسلمانوں کے اندر یہ جو نیا رجحان پیدا ہوا ہے یہ انشاء اللہ بڑھے گا۔ یہاں تک کہ وہ وقت آئے گا جب کہ مسلمانوں کے اندر یہاں کے ماحول میں عدم تحفظ کا احساس مکمل طور پر ختم ہو جائے۔ وہ ملک میں ترقی کے راستہ پر مزید آگے بڑھیں گے اور خود ملک کی ترقی میں اضافہ کریں گے۔

خاتمۂ کلام

آپ غالباً یہ سوال کریں کہ تمہاری رائے اور دوسروں کی رائے اتنی زیادہ مختلف کیوں ہے۔ ہندستانی مسلمانوں کے کیس کو دوسرے لوگ مظلومیت کا کیس بتاتے ہیں اور تم ان کے کیس کو قومی ترقی کا کیس بتا رہے ہو۔ اس فرق کا سبب زاویۂ نظر کا فرق ہے۔ میرا ریلسٹک اپروچ ہے اور دوسرے لوگوں کا نان ریلسٹک اپروچ۔ لوگ چیزوں کو اپنی خواہش کے مطابق دیکھنا چاہتے ہیں۔ جب کہ میں یہ دیکھتا ہوں کہ موجودہ دنیا میں کیا چیز ممکن ہے اور کیا چیز ممکن نہیں۔ کیونکہ قانون حیات کے تحت جو چیز ناممکن ہو اس کو آپ اپنی خواہش کے تحت اپنے لئے قابل حصول نہیں بنا سکتے۔

یہ دنیا خدا نے بنائی ہے اور وہ لازماً اسی نظام پر چلے گی جو نظام خدا نے اس کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ اس دنیا کے لئے خدا نے یہ اصول مقرر کیا ہے کہ یہاں پھول کے ساتھ کانٹا بھی موجود رہے۔ اب ایک شخص اگر اپنے ذہن میں یہ تصور قائم کر لے کہ پھول کو کانٹے کے بغیر ہونا چاہئے۔ ایسا شخص جب باغ کو دیکھے گا تو اس کی نظر کانٹے پر اٹک جائے گی۔ وہ باغ کو کانٹوں کا جنگل سمجھنے لگے گا۔ اس

کے برعکس جو شخص یہ جانے کہ پھول کے ساتھ کانٹے کا وجود لازمی ہے، وہ جب باغ کو دیکھے گا تو سارا باغ اس کو پھولوں کا چمنستان نظر آئے گا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ انسانی زندگی کا ہے۔ انسانی زندگی کو خدا نے مقابلہ اور مسابقت کی بنیاد پر قائم کیا ہے۔ اس نظام فطرت کی بنا پر اس دنیا میں ہمیشہ ایک دوسرے کے درمیان دوڑ جاری رہتی ہے۔ اس دوڑ میں ٹکراؤ کی نوبت آجاتی ہے۔ حتی کہ قرآن کے مطابق عداوت کی صورتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ خدا کا تخلیقی منصوبہ ہے اور اس منصوبہ کا یہ تقاضا ہے کہ دنیا میں خوشگوار باتوں کے ساتھ ناخوشگوار باتیں بھی ضرور موجود رہیں۔ چونکہ یہ خدا کا مقرر کیا ہوا قانون ہے اس لئے اس کے اثرات ہر جگہ پائے جائیں گے، خواہ وہ کوئی ہندو ملک ہو یا کوئی مسلم ملک۔

نقطۂ نظر کے اس فرق کا یہ نتیجہ ہے کہ جس چیز کو لوگ ظلم سمجھتے ہیں اس کو میں چیلنج کہتا ہوں۔ جس چیز کو لوگ تعصب اور امتیاز کہتے ہیں اس کو میں زندگی کی حقیقت سمجھتا ہوں۔ جس چیز کو لوگ سازش کا نام دیتے ہیں وہ میرے نزدیک مقابلہ کے مظاہر ہوتے ہیں۔

دوسرے لوگ اپنے غیر حقیقت پسندانہ معیار کی بنا پر یہ چاہتے ہیں کہ ہندستانی مسلمانوں کی زندگی میں کوئی ناخوشگوار پہلو نہ پایا جائے۔ اور جب وہ ایسا پہلو دیکھتے ہیں تو اس کے خلاف احتجاج شروع کر دیتے ہیں۔ مگر میں اس معاملہ کو حقیقت واقعہ کے معیار پر دیکھتا ہوں۔ اس لئے میں "کانٹے" والے پہلو کو نظر انداز کر کے "پھول" والے پہلو کو دیکھتا ہوں۔ اور پھر مجھے نظر آنے لگتا ہے کہ موجودہ دنیا میں قانون فطرت کے تحت جو کچھ ملنا ممکن ہے وہ مسلمانوں کو بھی اسی طرح مل رہا ہے جس طرح غیر مسلموں کو۔ مسلمان اگر اپنے لئے مزید کچھ چاہتے ہیں تو دوبارہ وہ قانون فطرت کے تحت عمل کر کے اس کو پا سکتے ہیں نہ کہ مطالبہ اور احتجاج کے ذریعہ۔

الرسالہ بک سنٹر

اردو، ہندی، انگریزی اور عربی میں ملک اور بیرونِ ملک
کی چھپی ہوئی دینی، علمی اور ادبی کتابوں کا عظیم مرکز

- قرآن • حدیث • تفسیر • سیرت وسوانح • فقہ وقانون
- عقائد • دعوت وتبلیغ • تاریخ • اسلامی تحریک • اخلاقیات
- خواتین اور بچوں کے لیے دینی اور اصلاحی کتابیں • ڈکشنریاں اور علمی مراجع
- پاکستان کی چھپی ہوئی علمی، ادبی اور دینی کتابیں • سیاست
- قاہرہ اور بیروت کی چھپی ہوئی عربی کتابیں • اسلامی معاشیات
- اردو، فارسی اور عربی ادبیات پر معیاری کتابیں • ثقافت اور تعلیم
- اسلامی مجلات ورسائل • دیگر ادیان ومذاہب کی بنیادی کتابیں
- زندگی کی تعمیر اور اصلاحِ انسانیت سے تعلق رکھنے والی بلند پایہ کتابیں
- اسلامی موضوعات پر آڈیو اور ویڈیو کیسٹ • طغرے اور عید کارڈ وغیرہ

نمبر ا نظام الدین ویسٹ مارکیٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳
فون: ۶۱۱۱۲۸، ۶۹۷۳۳۳

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحیدالدین خاں کے قلم سے

اردو	
تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمتِ قرآن	30/-
عظمتِ اسلام	6/-
عظمتِ صحابہ	6/-
دینِ کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہورِ اسلام	40/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
رازِ حیات	60/-
صراط مستقیم	40/-
خاتون اسلام	45/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروان ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسولؐ	35/-
ڈائری جلد اول	95/-
ڈائری جلد دوم	95/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	90/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	95/-
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	20/-
راہ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	50/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
اقوال حکمت	20/-

انوار حکمت	20/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	20/-
عقلیات اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	20/-
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دین فطرت	6/-
تعمیر ملت	6/-
تاریخ کا سبق	6/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارفِ اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	6/-
ایمانی طاقت	6/-
اتحاد ملت	6/-
سبق آموز واقعات	6/-
زلزلۂ قیامت	8/-
حقیقت کی تلاش	6/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	6/-
اسلامی دعوت	6/-
خدا اور انسان	6/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	5/-
دینی تعلیم	6/-
حیات طیبہ	6/-
باغ جنت	6/-
نار جہنم	6/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	6/-
شخصیاتِ اسلام	–
تعدد ازواج	3/-

روشن مستقبل	6/-
صوم رمضان	6/-
علم کلام	6/-
صداقتِ اسلام	–
علماء اور دورِ جدید	–
ہندستانی مسلمان	6/-
سیرتِ رسولؐ	
اسلام ایک عظیم جدوجہد	3/-
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/-
اسلام کا تعارف	2/-
ہندی	
سچائی کی تلاش	6/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
پیغمبر اسلام	3/-
منزل کی اور	3/-
عربی	
الاسلام یتحدی	85/-
الاسلام والعصر الحدیث	55/-
آڈیو کیسٹ	
A-1 حقیقتِ ایمان	25/-
A-2 حقیقتِ نماز	25/-
A-3 حقیقتِ روزہ	25/-
A-4 حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
A-5 حقیقتِ حج	25/-
A-6 سنتِ رسولؐ	25/-
A-7 میدانِ عمل	25/-
A-8 پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
A-9 اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
A-10 اسلامی اخلاق	25/-
A-11 اتحادِ ملت	25/-
A-12 تعمیرِ ملت	25/-
A-13 نصیحت لقمان	25/-

تذکیر القرآن کیسٹ (تلاوت، ترجمہ و تفسیر)	
A-14 متفرق سورتیں ۱	30/-
A-15 متفرق سورتیں ۲	30/-
A-16 متفرق سورتیں ۳	[illegible]
ویڈیو کیسٹ	
V-1 پیغمبر انقلاب	200/-
V-2 اسلام دائی امن	200/-
V-3 اسلام دورِ جدید کا خالق	200/-
V-4 امتِ مسلمہ اور جدید چیلنج	200/-
V-5 اسلام اور سماجی انصاف	200
V-6 اسلام اور دورِ حاضر	200/-

God Arises	75/-
Muhammad	75/-
The Prophet of Revolution	
Islam As It Is	40/-
God Oriented Life	60/-
Words of the Prophet	–
Introducing Islam	–
Religion and Science	30/-
[T]abligh Movement	20/-
[Isl]am the Voice of Human Nature	–
Islam the Creator of Modern Age	–
The Way to Find God	5/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-
Man Know Thyself!	4/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Social Justice in Islam	–
Polygam	3/-
Words of Wisdom	–

فائل الرسالہ اردو (مجلد)

سال 1982	80/-
1985	80/-
1986	80/-
1987	80/-
1988	80/-
1989	80/-
[19]90	80/-
[19]91	80/-

فائل الرسالہ انگریزی (مجلد)
1984 تا 1991 — 80/- فی جلد

فائل الرسالہ ہندی (مجلد)
1990-91 — 85/-

MAKTABA AL-RISALA C-29 Nizamuddin West, New Delhi-110 013

Single Copy Rs. 5 □ Annual Subscription Rs 60/$25